خطبات

حصہ دوم

از

حضرت علامہ سید محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارۂ نشر علوم دینیہ

PRICE; PAK. Rs 36/-
PRICE: FOR. $ 6/-

خطبات

حصہ دوم

علامہ سید محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارۂ نشرِ علوم دینیہ

جملہ حقوق بحق ادارۂ نشرِ علوم دینیہ
محفوظ ہیں

طبع سوم — ۱۹۸۶ء

تعداد — ۵۰۰

ناشر — ادارۂ نشرِ علوم دینیہ

طابع — راجپوتی شادی کارڈ و خطاطی مرکز (کراچی)

پتہ

ادارۂ نشرِ علوم دینیہ

سی-۹۶- بلاک ۱۰ فیڈرل بی ایریا کراچی۔ فون: ۶۸۳۰۲۵

فہرست

۱	سرورق	۱
۲	ضروری تفصیلات	۲
	فہرست	۳
۳	پیش لفظ	۵
۴	سیرت حضرت سید المرسلینؐ	۱۰
۵	سیرت النبیؐ	۱۹
۶	معراج رسولؐ	۲۸
۷	مساوات	۳۵
۸	اتحاد و اتفاق	۴۱
۹	شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن	۴۹
۱۰	بنائے لا الٰہ الا اللہ	۵۶
۱۱	فاطمہؓ کا لال	۶۷
۱۲	کربلا سے ہمیں کیا سبق ملا ہے قربانی کا!	۷۳
۱۳	شہادت کی عظمت	۸۱
۱۴	خاندانی نظام کی اہمیت	۸۷
۱۵	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	۹۶
۱۶	تسخیر کائنات	۱۰۰
۱۷	راہِ حق میں استقامت	۱۰۴
۱۸	امداد باہمی	۱۶
۱۹	کبر و غرور	۲۸
۲۰	اطمینان قلب	۳۵
۲۱	ثابت قدمی	۴۲
۲۲	مکر و فریب	۴۸
۲۳	سیرت رسول اسلام بحیثیت مدبر	۵۵
۲۴	شجاعت کا فلسفہ	۶۲

۲۵	خودداری	۱۶۳
۲۶	عہد و پیمان	۱۸۰
۲۷	حضرت امام جعفر صادقؑ	۱۸۶
۲۸	معراج	۲۰۲
۲۹	مرد مجاہد	۲۱۴
۳۰	اسلامی تعلیمات اور فطرت	۲۱۹
۳۱	عبادات اور اخلاق	۲۲۸
۳۲	آزادی کی اہمیت	۲۳۵
۳۳	سیرت النبیؐ کا عملی پہلو	۲۴۳
۳۴	مجاہدوں کی اعانت مجاہدوں کے متعلق ہمارا فرض	۲۶۱
۳۵	ذوالفقار حیدر کرارؑ	۲۶۹
۳۶	قماربازی	۲۸۱
۳۷	غور و فکر	۲۹۲
۳۸	جان نثار عباسؑ علمدار	۳۰۲
۳۹	حضرت علیؑ	۳۰۹
۴۰	شیر خداؑ	۳۱۷
۴۱	شاہ لافتیٰؑ	۳۲۹
۴۲	شیعہ غیبت امامؑ کے زمانہ میں دفاعی جہاد کو واجب سمجھتے ہیں مجاہدین اسلام کیلئے حضرت امام زین العابدینؑ کی مشہور دعا کے بعض جملے	۳۴۱
۴۳	خیبر شکن	۳۵۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

پیش لفظ

ہم خدائے عزّ وجل کا انتہائی عاجزی کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہم بہت ہی قلیل مدّت میں قوم کے سامنے اس دقیع علمی ہدیہ کا تیسرا ایڈیشن پیش کرنے کے قابل ہو سکے ہیں۔ یہ کتاب "خطبات حصّہ دوم" بھی حضرت علّامہ کی انٹرنیشنل تقریروں، نیز خصوصی مقالات پر مشتمل ہے، جن کی افادیت پر ہم فقط اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ یہ علّامہ جیسی عظیم شخصیّت کا نتیجۂ فکر ہیں اور ساری دنیائے اسلام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ بات قارئین کرام کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کتاب میں بھی تقریروں اور مضامین کے اندر کہیں کہیں آیات واحادیث کی تکرار

ملے گی۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے کے حصہ کے پیش لفظ میں لکھ چکے ہیں یعنی یہ تمام تقریریں اور مقالات الگ الگ موقعوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کبھی محل اور موقع کی یکسانیت کی وجہ سے اس قسم کا توارد ناگزیر ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ تقریریں اور مضامین تقریباً پندرہ سال کے مختلف مواقع سے متعلق ہیں جن میں پاک بھارت جنگوں کا تلخ ترین دور بھی شامل ہے اس لئے لازمی طور پر زمانہ کی خصوصی حیثیت کو بھی تقریر یا مقالہ کے انداز ادا اور طرز بیان میں بڑا دخل ہے۔ تاسیس پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں نسبتاً علامہ کی نثری تقریریں بہت کم تھیں۔ وہ پاکستان میں ۱۹۴۸ء اور اسکے چند سال بعد تک نو وارد ہونے کی وجہ سے گوناگوں داخلی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے اس لئے تحریر و تقریر کا سلسلہ بھی بہت کم تھا۔ اسکے بعد جسقدر زمانہ بڑھتا گیا نئی مشکلات کم ہوتی گئیں اور علمی کاوشوں کیلئے زیادہ موقع ملتا گیا اندرون ملک اور بیرونی دنیا کے سامعین کی قدر دانی اور انتہا پسندیدگی کی وجہ سے ریڈیو پاکستان پر علامہ کی نثری تقریروں کا

سلسلہ بھی برابر وسیع تر ہوتا چلا گیا اور یہ مقبولیت ریڈیو، ٹیلیویژن،
مجالس اور عام اجتماعات میں اب بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ان
سب باتوں کا فطری نتیجہ تھا کہ تقریر اور تحریر دونوں ہی میں زمانہ کیساتھ
ترقی اور جاذبیت بڑھے اور وقت کے بہاؤ کے شانہ بہ شانہ علامہ کے
قلم اور زور بیان کے افادات میں علمی فضاؤں کی تمام بلندیاں سمٹ
آئیں۔ غرض اس طرح تقریر یں اور مقالات کے معیار بھی بدلتے
رہے مگر ہم بعض مجبوریوں کی وجہ سے ان دونوں حصوں کی ترتیب
و تسلسل کو برقرار اور قائم رکھنے کے سلسلہ اور کوشش میں ان تقریروں
اور مضامین کے ساتھ ان کی تاریخ وار ترتیب قائم نہ کر سکے جس سے
قارئین کرام کو معیار تقریر و تحریر کے اس دھارے کی تبدیلیوں
اور تنوع کا پوری طرح ادراک ہو سکتا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض باتیں صرف
وقتی ہوا کرتی ہیں اور مستقل تصنیف میں ان کو باقی نہیں رکھا
جا سکتا اس لئے اس قسم کی بھی تبدیلیاں کرنا پڑی ہیں جس کا
صحیح اندازہ ہمارے قارئین کتاب کے مطالعہ کے وقت کر سکیں گے۔
جہاں تک کتابت کی اصلاح کا تعلق ہے، ہر مصنف اور ہر ناشر
کبھی اس چیز کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس کی کتاب میں غلطیاں باقی

رہیں اور اس کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہ اس میں ایک غلطی بھی باقی نہ رہے۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی جذبہ کے تحت پوری کوشش کی ہے کہ ہماری تمام کتابیں غلطیوں سے محفوظ رہیں لیکن پھر بھی ہم انسان ہی ہیں اور ہر وقت ہم سے غلطی اور فروگذاشت کا امکان ہے جس پر ہم پہلے ہی سے معذرت خواہ ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے ان تمام محسنوں کا دلی شکریہ ادا کریں جنہوں نے ہمیں ہر طرح کی امداد بہم پہنچائی۔ مالی بھی اور اخلاقی بھی۔

خدا ہمارے ان تمام سرپرستوں اور محسنوں کو اس کی بہترین جزا عطا فرمائے اور دنیا و آخرت میں ان کے مدارج کو بلند کرے۔ علم و فن کے ایسے ہی محسنوں اور قدردانوں کی ہمت افزائی اور قدردانی اس علمی انحطاط کے دور بے لبسی میں اہل علم کی زندگی اور ان کی علمی خدمات کو باقی رکھے ہوئے ہے اور انکے لیئے بہت بڑا سہارا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ علمی قدردانی

کا یہ جذبہ بارگاہ خداوندی کا عطیہ خاص ہے جو انھیں عطا ہوا ہے اور یہ وہ سعادت ہے، جو ہر ایک شخص کو حاصل نہیں ہوا کرتی اور نہ بغیر تائیدِ الٰہی صرف ذاتی کوششوں سے ملتی ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

آخر میں ہم ریڈیو پاکستان کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے ہمیں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع مل سکا ہے۔ ریڈیو پاکستان نے "قرآن حکیم اور ہماری زندگی" کا پروگرام شروع کرکے (جو کافی عرصہ سے جاری ہے) نہ صرف پاکستانی مسلمانوں کی بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی اور خود اسلام کی وہ خدمت انجام دی ہے جس پر اس کی جس قدر بھی تعریف کیجائے وہ کم ہے۔

سید شمیم عباس رضوی
آنریری معتمد عمومی
ادارۂ نشر علوم دینیہ
سی-۹۶- بلاک ۱۰ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی
فون : ۶۸۲۰۱۵

سیرت حضرتِ سیّد المرسلین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (آیہ/۱۲۹۔ رکوع ۱۵، سورۃ البقرۃ) اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں ایک رسول ان ہی میں سے مبعوث فرما جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے یقیناً تو بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے۔

یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی مبارک دعا کا ذکر ہے جو انھوں نے اس وقت کی تھی جب اللہ کے یہ پاک بندے خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ وہ عرض کر رہے تھے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ اے ہمارے پروردگار تو ہمیں اپنا فرماں بردار باقی رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک فرماں بردار امت پیدا کر اور ہمیں ہمارے احکام حج بھی بتا دے اور ہمارے حال پر

توجہ فرما کہ یقیناً تو بڑا توجہ فرمانے والا ہے۔ بڑا رحمت والا ہے۔ اس دعا کے بعد ہی فوراً یہ بھی عرض کیا گیا کہ ان لوگوں میں سے ان کی طرف ایک رسول بھی مبعوث فرما۔ یہ جملہ صاف طور پر اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ "منھم" کی ضمیر جمع اولاد حضرت ابراہیمؑ اور اسی خاص اُمّتِ مُسلمہ کی طرف ہے جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے اور دعا یہ تھی کہ اولاد ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ میں سے ایک نبی آئے جو انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفسوں کی تطہیر کرے۔ یہود و نصاریٰ کہا کرتے تھے کہ نبوّت بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے مگر اللہ نے دکھا دیا کہ اُس کا دیا ہوا عہدۂ رسالت و نبوّت کسی خاندان اور کسی نسل کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا بلکہ وہ جسے چاہتا ہے اس جلیل مرتبہ کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نامور جد حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول ہو گئی اور یتیم عبدؑ اللہ، نورِ نگاہِ آمنہؑ، حاصلِ کائنات، فخرِ موجودات، رسُولِ اُمّیِّ عربی قیامت تک باقی رہنے والی شریعت لے کر تشریف لائے اور اہل کتاب کا یہ دعویٰ غلط ہو گیا کہ نبوّت و رسالت بنی اسرائیل ہی کے لیے مخصوص ہے۔

سرورِ دو عالم اسی لیے فرماتے تھے کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کی دعا ہوں۔ مگر یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضورؐ کی بعثت اور آپ کی

نبوّت کا تعلق صرف بنی اسمٰعیلؑ اور اُمّتِ عرب ہی سے ہے اور دنیا کی دوسری قوموں یا اہل کتاب سے نہیں ہے اس لیئے کہ دعائے ابراہیمیؑ سے تو فقط یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آنے والا نبی کس خطہ سے ظاہر ہوگا اور اپنے کارِ تبلیغ کی ابتدا، کہاں سے اور کس قوم سے کریگا۔ اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اس نبیؐ کی نبوت اور رسالت ایک مخصوص قوم اور نسل یا محدود خطّہ اور زمانہ کی پابند ہوگی اور اسی حقیقت کو بتانے کے لیئے کہ خاتم الانبیاءؐ کی رسالت کسی حیثیت سے بھی محدود نہیں ہے قرآنِ حکیم نے جابجا آپ کی رسالت کے درجات اور حدود کی تشریح کردی ہے (سورۂ شعراء ۲۱۴ میں ارشاد ہوا ہے: "وَاَنذِرْ عَشِیرَتَکَ الْاَقْرَبِینَ" یعنی اے نبی تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذابِ خدا سے ڈراؤ۔ یہ نبوّت و رسالت محمدیؐ کی پہلی منزل تھی جس کی ابتداء رشتہ داروں اور خاندان والوں سے ہوئی تھی اس کے بعد دوسری منزل وہ ہے جسے سورۂ انعام ۹۲ اور سورۂ شوریٰ میں اس جملہ سے بتایا گیا ہے: "لِتُنذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا" مطلب یہ ہے کہ اے رسولؐ ہم نے تم پر قرآن اس لیئے اتارا ہے کہ تم مکّہ والوں اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈراؤ۔ اس منزل کے بعد اب تیسرا

مقام وہ ہے جہاں رسالتِ محمدیؐ کی حدوں کو اور زیادہ وسعت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ سورۂ سبا میں اللہ نے ارشاد کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

"اے رسولؐ ہم نے تمہیں سارے ہی انسانوں کے لیئے بھیجا ہے، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

قرآن حکیم کے اس اعلان سے ظاہر ہو گیا کہ رسالتِ سرورِ دو عالمؐ کا تعلق کسی ایک زمانہ اور کسی مخصوص قوم اور نسل سے نہیں ہے بلکہ وہ قیامت تک آنے والی تمام نسلوں سے تعلق رکھتی ہے اور جو بھی انسان کہے جانے کا مستحق ہے وہ اس رسالت و قیادت کے زیر اقتدار ہے خواہ وہ کسی زمانہ میں ہو اور کسی خطۂ زمین میں آباد ہو۔ رسالتِ محمدیؐ کی ان تین منزلوں کو بیان کرنے کے بعد پھر یہ بتایا گیا کہ اس عظیم ترین نبوت و رسالت و امامت کی حدیں فقط یہاں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ اس کی وسعت لا محدود ہے۔ یہ نہ کسی زمانہ کے ساتھ مقید ہے اور نہ موجوداتِ عالم کی کسی نوع اور کسی قسم کی پابند ہے۔ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیئے سورۂ فرقان میں فرمایا گیا ہے:۔ تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ

لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْراً ۔ (آیہ/۱)

بہت با برکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ (محمدؐ) پر قرآن اتارا تاکہ وہ تمام عالمین کے لیئے خدا کے عذاب سے ڈرانے والا ہو۔ اس اعلانِ عام میں نہ تو کسی مخلوق کی تخصیص ہے، نہ زمان و مکان کی قید ہے۔ نہ رنگ اور خطہ کا تفرقہ ہے۔ نہ جنّ و انس کا امتیاز ہے اور نہ زمین و آسمان کا کوئی فرق ہے بلکہ خود لفظ "عالمین" کی وسعت بتا رہی ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات ربُّ العالمین ہے اسی طرح اس نے اپنے حبیبِ خاص اور فخرِ موجودات کو تمام عالمین اور سارے جہان کے لیئے اپنا رسولِ رحمت بنایا ہے اور وہ قیادت و رسالت اور امامت جو اس سے پہلے صرف انسانوں پر قائم تھی اب اُسے لامحدود بنا کر پوری کائنات اور کلِ موجوداتِ عالم کے ذرہ ذرہ پر محیط کر دیا گیا۔ حضرتِ ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی دُعا میں حضرت نبی عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض بھی ظاہر کی اور خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ وہ رسولؐ تیری آیتوں کو پڑھ کر سنائے، لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دے اور اُن کے نفسوں کی تطہیر بھی کرے۔ یہ ہیں وہ فرائض رسالتِ عظمیٰ جو انتہائی اجمال اور اختصار کے ساتھ اس مبارک دعا کے بیان

ہیں اور قرآنِ حکیم میں دوسرے مقامات پر جہاں رسول اُمّی کا ذکر ہے ظاہر کیئے گئے ہیں۔ ان فرائض کے تین مرتبے بتائے گئے ہیں ایک آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت کرنا یعنی رسولِ اعظم کا پہلا کام اور پہلی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو اس کی آیتیں اور اس کا پیغام اور کلام سنائیں اور اسکی عظمت و قدرت کو بیان کریں پھر اس پیغام رسانی اور تلاوتِ آیات کے بعد دوسرا کام یہ ہے کہ وہ بحیثیت معلّم اعظم کتاب اللہ کے رموز و اسرار کی دنیا والوں کو تعلیم بھی دیں اور نہ صرف کتاب کی تعلیم، بلکہ اُمت کی فکری صلاحیتوں کو اجاگر کریں اور اس کی سوئی ہوئی عقلی قوتوں کو بیدار کریں اور اسے عقل و حکمت سے فائدہ اٹھانے کے راستے بتائیں اس لیئے کہ پیغام الٰہی کا سمجھنا اس بات پر موقوف ہے کہ انسان اپنی عقل و فکر کا استعمال صحیح طریقہ پر کرے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو کبھی ہر گز وہ الٰہی پیغام کے رموز کو نہ سمجھ سکے گا اس کے بعد تیسرا قدم تزکیۂ نفس کا ہے یعنی اُمّت کے کردار کی تطہیر کرنا بھی رسولِ اعظم کے فرائض میں داخل اور آپ کی بعثت کے اغراض میں شامل ہے۔

سرورِ دو عالم نے دنیا میں تشریف لا کر اپنی رسالت و امامت کے پہلے فرض کو اس طرح پورا فرمایا کہ قرآن حکیم کی آیتوں کی تلاوت

کی اور انھیں پڑھ کر سنایا اور اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک بلکہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ تک پہنچا دیا اور وہ آواز جو کوہِ حرا کے ایک چھوٹے سے غار سے ابھری تھی چند ہی لمحوں میں ہر خشک و تر اور بحر و بر اور زمین و آسمان کے گوشہ گوشہ میں گونجنے لگی - نبیؐ عربی آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے رہے اور اللہ اپنے حبیبؐ کی تصدیق فرماتا رہا وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَویٰ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم ۳) اور وہ نبیؐ تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے" حضورؐ نے قرآنِ مجید کی آیتوں کی تلاوت فرمائی اور اللہ کا وہ عظیم کلام دنیا والوں کو سنایا جس کا ہر سورہ، ہر آیت اور ہر لفظ معجزہ ہے اور ہدایت و ارشاد سے لبریز ہے - قیامت تک دنیا اس کی ایک سطر اور ایک چھوٹے جملہ کا بھی جواب نہیں لا سکتی - اس کے بعد آپ نے دوسرے فرض کو اس طرح پورا کیا کہ آیاتِ الٰہیہ کا مطلب سمجھایا اور ان کے اسرار و رموز سے انسان کو آگاہ کیا اور اس پورے نظامِ زندگی کی مکمل تشریح کر دی جو اللہ نے بنی نوع انسان کے لیئے مقرر فرمایا ہے - یہاں تک کہ زندگی اور موت، دنیا اور آخرت کی کوئی ایسی بات باقی نہ رہی جس کی کوئی نہ کوئی بنیاد رسولؐ اکرم کی زبانِ اقدس سے نہ سنی گئی ہو - آپ نے عبادت کے طریقے بتائے - اخلاق و عادات کی اصلاح

کی صورتیں سمجھائیں، معاملات اور بود و باش کے بہترین اصول کی تعلیم دی، اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ضابطوں کی وضاحت فرمائی، حق اللہ اور حق العباد کے ہر رُخ پر روشنی ڈالی اور کتاب و حکمت کی اس طرح تعلیم دی کہ اب انسان کے پاس کسی بات کے نہ سمجھنے کا کوئی عذر ہی باقی نہ رہ سکا اور پھر آخر میں تزکیۂ نفوس اور تطہیر کردار کے لیئے ہر ممکن کوشش فرمائی اور اس فرض کو پورا کرنے کے لیئے سب سے پہلے خود اپنی ہی سیرت طیبہ کو پیش فرمایا اور قرآن پکار اٹھا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰہَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰہَ كَثِيرًا (الاحزاب ۲۱)

"تمہارے لیئے رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔ اُس شخص کے لیئے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتا ہو اور کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرتا ہو"

ایک معلّم اور مصلح کی ہدایت پوری طرح دلوں پر اُس وقت اثر کرتی ہے جب اس کا عمل اور اس کی سیرت بھی اُس کے قول کے مطابق ہو اور وہ سیرت و عمل دوسروں سے پوشیدہ نہ ہو یہی وجہ ہے کہ تطہیرِ کردار کے عظیم کام میں سرورِ دو عالم کو وہ مقام حاصل ہے جس کی دوسری مثال ہمیں نہیں ملتی اس لیے کہ بچپنے سے

جوانی اور بڑھاپے تک آپ کی سیرتِ پاک کا ہر پہلو ہمارے سامنے موجود ہے جس میں نہ کوئی پردہ اور حجاب ہے اور نہ کوئی شک و شبہہ اور اجمال و اخفا ہے۔ اس لیئے قافلۂ زندگی کے ہر قدم پر ہم آپ کی سیرت پاک کی مثال کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے کردار کی اصلاح اور تطہیر کر سکتے ہیں اور یہی وہ تنہا راستہ ہے جس میں ہماری دنیوی اور اُخروی فلاح و نجات پوشیدہ ہے۔

خدا ہم سب مسلمانوں کو اُسوۂ حسنۂ سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین)

سیرۃ النبیؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَیُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَیِّکُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ (پارہ ۲۹ سورۃ القلم) (آیات ۱-۶)

نون اور قسم ہے قلم کی اور اُس کی جو کچھ وہ لوگ لکھتے ہیں تم اپنے پروردگار کے فضل سے مجنون نہیں ہو اور بیشک تمہارے لیئے بے انتہا ثواب ہے اور یقیناً تم بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر فائز ہو تو عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے مجنون کون ہے۔

علم و کمال سے بے خبر دنیا والے نبیِّ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معاذ اللہ مجنون کہا کرتے تھے اس لیئے کہ ان لوگوں میں اتنی عقل نہ تھی کہ وہ مرتبۂ نبوت کی رفعت و بلندی کو سمجھ سکتے بالکل اسی طرح جیسے ایک اندھا دن کو رات سمجھتا ہے کیونکہ اُس کی آنکھوں میں بصارت ہی نہیں جس سے وہ دن کی روشنی کو دیکھ سکے بس اسی طرح وہ لوگ

جو باطنی نور سے محروم تھے اور جنکی روح جہالت کے اندھیروں میں گم تھی وہ رسالت کے مہر نیمروز کی شعاعوں کو کس طرح دیکھتے اور ان کی سمجھ میں یہ بات کس طرح آتی کہ ایک انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے جسے اللہ اپنی رسالت کا منصب جلیل عطا فرمائے اور اس کو وہ مقامِ قرب عنایت کرے جو کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو، اس پر اپنی کتاب اتارے اور وحی نازل فرمائے اور وہ تمام کائنات کو ہدایت کے راستہ پر لگانے کا فرض انجام دے اور عالم کی کوئی قوت اس عظیم الشان اور اللہ کے برگزیدہ بندہ کو اس کے فرضِ ہدایت کی انجام دہی سے روک نہ سکے اور وہ پاک انسان دنیا میں ظاہر ہو کر بنی نوع بشر کو اس صحیح مقام و منزلت و عزت سے آگاہی بخشے جو اسے کائنات کے معاشرہ میں حاصل ہے وہ رہبر کامل پوری انسانیت کی رہبری فرمائے اور اسے جہالت کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت کے اجالوں میں لے آئے اور ان چیزوں کی پرستش سے اسے نجات دلائے جو خود اس کی خدمت کے لیئے خلق کی گئی ہیں چونکہ جاہل اور غافل انسانوں کے ضمیر ان حقیقتوں سے نا آشنا تھے اور معرفت و فکر کی اس بلند سطح سے بہت پست تھے ، اس لیئے جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

خدائے واحد و یکتا کا اعلان کرتے ہیں اور لات و عزیٰ اور ھُبل کو
ایک بے بس حقیر پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتے اور اُن پیشانیوں کی
ذرا بھی عزت نہیں کرتے جو ان بتوں کے سامنے سجدہ ریز رہا کرتی ہیں
اور ان لوگوں کو حیوانوں سے بھی بدتر جانتے ہیں جو ان اصنام کو اپنا
آبائی قاضی الحاجات سمجھتے رہے ہیں تو یہ سب کچھ دیکھ کر ان گمراہ انسانوں
کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ حضورؐ کو العیاذ باللہ
مجنون کہنے کی جسارت و بے ادبی کریں۔ اس جسارت کا جواب اللہ
نے اس طرح دیا کہ خود اپنے رسولؐ سے خطاب فرمایا۔ "مَا اَنْتَ
بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ" ، تم اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے ہرگز
مجنون نہیں ہو۔ اور پھر فرمایا کہ تمہارے لیئے تو اس رسالت کے عوض
میں ایسا دائمی ثواب ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا اور تم تو بڑے بلند و برتر
اخلاق پر فائز ہو اور آخر میں یہ ارشاد ہوا کہ "تم خود بھی دیکھ لوگے اور
جو لوگ تمہارے مقابلہ میں یہ گستاخیاں کرتے ہیں وہ بھی دیکھ لیں گے
کہ دیوانہ اور مجنون کون ہے"۔ اللہ! کلام خداوندی کی بلاغت و
عظمت! کہ اسے بھی گوارا نہیں کیا جاتا کہ وحی الٰہی کا خطاب کافر و
مشرک انسانوں کی طرف بھی ہو اور انھیں براہِ راست ان کی اس
بے ادبی کا جواب دیا جائے بلکہ یہاں فقط اپنے حبیبؐ کی طرف

خطاب فرماکر انتہائی بلیغ انداز میں ان منکرین حق کی گمراہی اور بے ادبی کا جواب بھی کتنا دنداں شکن کہ اس دیوانگی کا ثبوت تو عنقریب خود بخود مل جائے گا کہ کون دیوانہ ہے - آنے والی تاریخ بتائے گی، مستقبل کے تاریخی ورق اس جسارت کے جواب کو ابھار کر پیش کر دیں گے اور دنیا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ مجنون کون تھا اور فرزانگی ودانائی کس کے پاس تھی، کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔

آج وہ دیوانے انسان جو رسُولِ عربی کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے کائنات کے اندھیروں میں اور ذلت ورسوائی کے گہرے غاروں میں اس طرح گم ہو چکے ہیں کہ ان کا کہیں نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔ نہ ان کا اقتدار ہے نہ ان کی دولت وعزت ہے اور نہ ان کی شان وشوکت باقی ہے مگر وہ یتیم عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی بارگاہ میں وہ طاغوتی گروہ گستاخیوں کا ارتکاب کیا کرتا تھا آج بنی نوعِ انسان کے ذہن وضمیر پر حکمرانی کر رہا ہے اور اس بلند ترین انسان کی لائی ہوئی شریعت اور کتابِ الٰہی پوری انسانیت کے لیئے سرچشمہ ہدایت ہے۔ ان آیات میں اخلاقِ نبوی کی مدح وثنا کی گئی ہے۔ بلاشبہ آپ کی ذاتِ گرامی بہترین اخلاق کی اس منزل پر تھی جہاں کسی اور کا گزر نہیں ہو سکتا - آپ کی سیرتِ پاک اور بلند کردار کا اعتراف

تو ان لوگوں کو بھی تھا جو آپ کے سخت ترین دشمن تھے۔ انسانی اخلاق کے ہزار ہا گوشے ہیں مگر حضورؐ کی ذاتِ اقدس اخلاق کی ہر قسم اور ہر رُخ کے لیئے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ اُمہاتُ المؤمنینؓ اور صحابہؓ کرام کا متفقہ بیان ہے کہ حضورؐ انتہائی نرم مزاج تھے اور بہترین سیرت کے مالک تھے۔ حضرت اُمّ المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ نے ایک مرتبہ خدمتِ گرامی میں عرض کی تھی: خدا کی قسم آپ صلۂ رحم کرتے، مقروض لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت فرماتے ہیں، حق کی نصرت و حمایت کرتے ہیں اور مصائب و آلام میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ اس لیئے یقیناً خدا آپ کو غمگین نہیں کرے گا۔ سرورِ کائنات کی امانتداری ایسی تھی کہ آپ کے دشمن تک آپ کو "امین" کے لقب سے یاد کرتے تھے اور اسی امانت کی صفت کا یہ نتیجہ تھا کہ ہجرت کی شب میں جب حضرت علیؓ بن ابی طالب کو اپنے بستر پر آرام کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ میرے پاس اہلِ مکہ کی جس قدر امانتیں ہیں ان سب کو واپس کرنا اس کے بعد مدینہ کی طرف روانہ ہونا۔ عام لوگ ایسے وقتوں میں ان باتوں کا کہاں خیال رکھتے ہیں لیکن حضرت سرورِ انبیاءؐ کی ذاتِ گرامی کا کوئی عمل ایسا نہ تھا جو امانت داری اور عدل و انصاف کے خلاف ہو۔

آپ کبھی کسی کو برا نہیں کہتے تھے۔ برائی کے عوض میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو معاف کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، کبھی کسی شخص کو یہاں تک کہ کنیز و غلام اور جانوروں کو بھی اذیت نہیں دی، کبھی کسی کی جائز درخواست رد نہیں کی۔ اگر کسی کی طرف سے کبھی کوئی ایسی بات ہوتی تھی جو طبعِ رسالت پر گراں گزرتی تھی تو آپ اُس سے چشم پوشی اور درگزر فرماتے تھے، آپ نے کبھی کسی امیدوار کو مایوس نہیں کیا، آپ کی عادت تھی کہ جب کوئی دوسرا گفتگو کرتا تھا تو آپ اس کی بات کو کاٹتے نہ تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے، اسی طرح دوسروں کے مُنہ سے اپنی تعریف سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی آپ کے احسان کا شکریہ ادا کرتا تھا تو اسے قبول فرماتے تھے۔

ایک وہ وقت تھا جب آنحضرت نے قیصرِ رُوم ہرقل کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے خط بھیجا تھا تو اس نے بڑے انتظام کے ساتھ دربار منعقد کیا اور حکم دیا کہ بیت المقدس میں جو اہلِ مکہ

بغرض تجارت آئے ہوئے ہوں انھیں بلایا جائے اتفاق سے اس زمانہ میں عرب تاجروں کیساتھ ابوسفیان بھی مقیم تھا جو اسوقت تک مسلمان نہیں ہوا تھا، جب یہ لوگ دربار میں آئے تو قیصر نے ابوسفیان سے رسول کریم کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کی تھیں - اُن میں سے ایک یہ بات بھی دریافت کی تھی کہ انہوں نے کبھی کسی عہد و قرار کی خلاف ورزی تو نہیں کی ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا پھر قیصر نے پوچھا کہ آخر وہ کہتے کیا ہیں تو ابوسفیان نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامنی اختیار کرو، سچ بولو اور صلۂ رحم کرو۔ اس پر قیصر نے کہا کہ اگر میں وہاں جا سکتا تو ایسے انسان کے پیر دھو کر پیتا۔ اسی طرح جب ۵ بعثت میں مسلمانوں نے ملک حبش کی طرف ہجرت کی تھی تو وہاں کے بادشاہ نجاشی سے حضرت جعفر ابن ابیطالبؑ نے سیرت سرورِ کائنات کے متعلق یہ کہا تھا کہ اے بادشاہ ہم لوگ جاہل تھے، ہم میں ہر طرف ظلم وستم کا رواج تھا اور قوی لوگ کمزوروں کے لیئے عذاب بنے ہوئے تھے اسی اثناء میں ہم ہی میں سے ایک شخص پیدا ہوا جس نے ہمیں اسلام کی دعوت دی، لوگوں کو بت پرستی سے روکا اور حکم دیا کہ وہ سچ بولا کریں، خون بہانے سے باز رہیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو تکلیف نہ دیں۔

اور آپکے حق ادا کریں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ ادا کریں
ہم سب اُن پر ایمان لائے ہیں اور اسی ایمان کی وجہ سے ہماری قوم
ہماری دشمن بن گئی ہے۔ ایک وہ بھی تاریخی وقت تھا جب حضرت ابو طالب علیہ السلام
اور دوسرے ارکانِ خانوادۂ بنی ہاشم سرورِ کائنات کا پیغام شادی لیکر
حضرت خدیجہؓ کے والد کے پاس گئے تھے تو حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچازاد
بھائی ورقہ بن نوفل سے کہا تھا کہ ورقہ! تم کو تو تمام سردارانِ عرب کا
حال معلوم ہے اگر تم فرزندِ عبداللہ کے متعلق کچھ عیب جانتے ہو تو مجھ
سے ضرور بیان کرو۔ ورقہ آسمانی کتابوں کے زبردست عالم تھے اور خود
مذہب عیسوی کے پیرو تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اچھا خدیجہ میں تمہارے
حکم کی تعمیل کرتا ہوں اور ان کے عیب بیان کرتا ہوں۔ اَصْلُہٗ اَصِیْلٌ
وَفَرْعُہٗ طَوِیْلٌ وَطَرْفُہٗ کَحِیْلٌ وَخُلْقُہٗ جَمِیْلٌ وَفَضْلُہٗ عَمِیْمٌ وَجُوْدُہٗ عَظِیْمٌ۔ ان کا
نسب بے نظیر ہے، اُن کا خاندان بہت وسیع ہے۔ آپکی آنکھیں سرمگیں
ہیں، اُن کے اخلاق بے حد جمیل ہیں، ان کا احسان سب پر عام ہے،
اور اُن کی سخاوت کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے پھر کہا
ورقہ یہ تو تم انکی فضیلت بیان کر رہے ہو میں نے تو اُن کے عیب
پوچھے تھے۔ ورقہ نے کہا ہاں خدیجہ سنو اب بیان کرتا ہوں۔
وَجْہُہٗ اَقْمَرُ وَجَبِیْنُہٗ اَزْہَرُ وَطَرْفُہٗ اَحْوَرُ وَخَدُّہٗ اَزْہَرُ مِنَ الْوَرْدِ الْاَحْمَرِ وَرِیْحُہٗ

أَذْكَىٰ مِنَ الْمِسْكِ الْأَذْفَرِ وَإِذَا مَشَىٰ كَأَنَّهُ الْبَدْرُ إِذَا ابْرَزُوا الْوَبْلُ إِذَا مَطَرَ، ، اُن کا چہرہ چاند سے زیادہ نورانی، اُنکی پیشانی بے حد روشن اُنکی آنکھیں حد سے زیادہ حسین وجمیل، اُن کے رخسار سُرخ گلاب سے زیادہ حسین، اُنکے بدن کی خوشبو مشک کی خوشبو سے تیز تر، اُنکا کلام شکر سے زیادہ شیریں، وہ جب راہ چلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں رات کا چاند نکل آیا اور اسطرح سخاوت کرتے ہوئے چلتے ہیں جیسے ابر گوہر بار موسلا دھار برس رہا ہو۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا کہ ورقہ تم نے پھر اُن کا کوئی عیب نہیں بیان کیا اور فضائل ہی ذکر کر دیئے آخر اُن میں عیب کیا ہے۔ ورقہ نے کہا خدیجہؓ! اگر محمدؐ میں کوئی عیب نہ ہو تو میں کہاں سے لے آؤں اور پھر میری کیا مجال کہ میں محمدؐ کے فضائل بیان کر سکوں یہ تو بس ایک معمولی سا تذکرہ تھا اُن صفات کا جو اُن کی ذات گرامی میں موجود ہیں اور ایک قطرہ تھا اس سمندر کا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ خود بھی کمالات وصفات محمدی سے خوب واقف تھیں مگر چاہتی یہ تھیں کہ دوسروں کی زبان سے بھی اس حاصلِ گلستانِ کائنات کی مدح وثنا سُن لیں اور یہ دیکھ لیں کہ صاحبانِ فہم وبصیرت کے دلوں پر اس شاہکارِ قدرت کا کس طرح سکہ جما ہوا ہے۔

معراجِ رسولؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ سُبحَانَ الَّذِیٓ اَسرٰی بِعَبدِہٖ لَیلًا مِّنَ المَسجِدِ الحَرَامِ اِلَی المَسجِدِ الاَقصَا الَّذِی بٰرَکنَا حَولَہٗ لِنُرِیَہٗ مِن اٰیٰتِنَا ط اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیعُ البَصِیرُ ہ (الاسراء) آیہ ۱

یعنی وہ ذات پاک ہے جو راتوں رات اپنے بندہ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جسکے گرد ہم نے برکت رکھی ہے تاکہ اس بندہ کو ہم اپنی قدرت کی کچھ نشانیاں دکھائیں بے شک وہی بڑا سننے والا بڑا دیکھنے والا ہے۔

اس آیہ کریمہ سے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ ہے، جیسے واقعۂ "اِسراء) بھی کہتے ہیں اور کبھی "اِسرآء" کے لفظ کا اطلاق سرورِ کائنات کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر پر ہوتا ہے اور "معراج" سے اُس حصۂ سفر کو مراد لیا جاتا ہے جو حضورؐ نے سِدرَۃُ المنتہیٰ سے آگے کے لیئے کیا تھا۔ اس معراج سے مراد یہ ہے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنے جسم مبارک کے ساتھ عالمِ بیداری ہی شب کے وقت عالمِ ملکوت

ولاہوت کی سیر فرمائی اور ان عالموں کے علاوہ جن جن عالموں کے لیے خدا کی مشیت ہوئی اُن سب کو آپ نے دیکھا۔

دوسرے اُولوا العزم مرسلین کے واقعات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کبھی کسی نہ کسی زمانہ میں اور کسی نہ کسی حد تک یہ منزلت دی گئی تھی۔

زمانی اور مکانی قیدوں اور رکاوٹوں کو اُن سے دور کیا گیا کائنات کے مخفی راز اور ملکوت وجبروت وناسوت ولاہوت کے چھپے ہوئے بھید بے نقاب کر کے اُنکے سامنے لائے گئے اور وہ اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق فیض ربانی سے مستفیض ہوتے رہے۔

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو جب منصب خلافت الٰہیہ عطا ہوا تو ارشاد ہوا: وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (انعام / ۷۵) اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ملکوت سماوات و ارض یعنی آسمانوں اور زمین کی سلطنت دکھائی گئی تھی (توراۃ تکوین ۲۸) میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے "حاران" کی طرف جانے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی اسی قسم کے بعض مشاہدات کا بیان بھی موجود ہے جیسے معراج کے ایک مرتبہ اور ایک منزل سے

تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو کوہِ طور پر تجلّی حق کا پرتو نظر آیا۔ یہ انکی معراج تھی۔ اولوالعزم انبیاءؑ کے علاوہ دیگر انبیاءؑ و مرسلینؑ کے واقعات بھی اس سلسلہ میں موجود ہیں اور ہر نبیؑ اور رسولؐ نے اپنے رتبہ اور منزلت کی مناسبت سے رموزِ قدرت اور اسرارِ کائنات سے آگاہی حاصل کی اور یہ جس حد تک بھی ہو انکی بلندی اور معراج تھی جس طرح حدیث رسولؐ کی بناء پر مؤمن کی نماز اسکی معراج ہوا کرتی ہے " اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ " مگر یہ جتنی معراجیں ہیں وہ صرف درجات کی بلندیاں ہیں اور حقیقی معراج وہی ہے جو سرکارِ دو عالمؐ کو حاصل ہوئی جو بلندیوں کی انتہا ہے۔ چونکہ آپ کی ذاتِ اقدس اولین و آخرین میں سب ہی سے افضل تھی اس لئے حریم قدس اور حرم لاہوتی میں آپکو وہ مقام عطا ہوا جو نہ کسی مَلَکِ مقرّب کو مل سکا اور نہ کسی نبیّ مرسل کو حاصل ہوا۔ اور جو خاص معراج آپ کو حاصل ہوئی وہ آپ ہی کی ذات کیلئے مخصوص تھی۔

آپ اس منزل سے بھی آگے تشریف لے گئے جہاں فرشتۂ وحی حضرت جبرئیل کو یہ کہنا پڑا : لَوْ دَنَوْتُ اَنْمُلَۃً لَاحْتَرَقْتُ" یعنی اگر میں اس جگہ سے انگلی کی ایک پور کے برابر بھی آگے بڑھ جاؤں گا تو شدّتِ نور اور جلوۂ قدس کی برقتابیوں اور بے پناہ تابانیوں کو

سہار نہیں سکتا۔

صحیح اور معتبر روایتوں کے مطابق یہ معراج صرف ایک مرتبہ ہوئی تھی۔ واقعۂ معراج کو کثیر التعداد راویوں نے بیان کیا ہے۔ علامہ زُرقانی نے ۴۵ صحابیوں رضی کا نام لکھا ہے اور اُن تمام کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں جن میں انکی بیان کی ہوئی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ زُرقانی کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس واقعہ کو تواتر کیساتھ نقل کیا ہے جس کے بعد اس میں کسی قسم کے بھی شک کی گنجائش ممکن نہیں ہے۔ بعثت کے بعد اور ہجرت کے پہلے وہ مبارک سال اور مبارک گھڑی آئی جو اللہ نے اس حاصل گلشنِ عالمِ تکوین یعنی حضرت سید المرسلین کی سیرِ ملکوت اور مشاہدۂ عالمِ قدس کے لیئے معین فرمائی تھی۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ میرے حبیبِ خاص کیلیئے افلاک کے راستوں کو سجائیں، رضوان جنت کو ہدایت کی گئی کہ اس مسافرِ ملکوت و لاہوت کیلیئے اسی کی عظمت کے مطابق خلدِ بریں کو مزین کرے، جبرئیل امین کو اشارۂ قدرت ہوا کہ محبوبِ کبریا کے لیئے وہ سواری لیجائیں جو برق سے زیادہ تیز رفتار اور شعاعِ مہر سے زیادہ سُبک خرام ہو اور جو اس رہ نوردِ خطۂ نور کی شان کے لائق ہو۔

عالمِ آب و خاک کی بندشیں ٹوٹنے لگیں، آگ اور ہوا کی

فطرتیں معطل ہونے لگیں، فضا نے راستہ دیا، افلاک نے اپنے دروازے کھول کر ادب سے راہ دی، کائنات کی فضاؤں نے سواری نور کو دوش پر اٹھایا اور زمان و مکان کی ہر چیز نے اس مسافر کے استقبال میں آنکھیں فرش کر دیں۔

اُدھر وحیِ الٰہی کی آواز سے سارا خطّۂ لاہوتی گونجنے لگا:
سُبْحَانَ الَّذِیٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا"

ظاہری حیثیت سے یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ایک وہ جسم جو بظاہر مادی ہو پلک جھپکتے ہی آسمانوں میں پہنچ جائے اور کائنات کی سیر کر کے جلدی سے واپس آجائے مگر یہ اُس قادرِ مطلق اللہ کے لیئے کیا دشوار ہے جس نے معمولی ایٹمی ذرات میں سرعت رفتار کی وہ کمالات ودیعت کی ہے جسے دیکھ کر آج دنیا حیران ہے۔ کیا وہ قدرت والا اللہ اس پر قادر نہیں ہے، کہ اپنے حبیب خاص اور سردار کائنات کو یہ طاقت دے کہ وہ افلاک کی سیر کر سکیں۔ ہمارے سامنے سرعت رفتار کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ روشنی کی رفتار، آواز کی رفتار، سیاروں کی حرکت اور خود انسان کے نورِ نگاہ کی سرعت رفتار جس کی انتہا نہیں ہے۔ اُدھر آنکھ کھلی اور مسافرِ نور کے سامنے سے پردہ اٹھا کہ

ایک لمحہ میں وہ کروڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے ستاروں تک پہنچنے لگا اور آنکھ کی ننھی سی پتلی میں خدا کی وسیع کائنات سمانے لگی۔ یہ تو ایک معمولی سی مخلوق کی تیزیٔ رفتار کا عالم ہے تو پھر اس کی سرعتِ سیر کو کون بیان کر سکتا ہے جس کے صدقہ میں اس پوری کائنات کو وجود اور زندگی کی نعمت نصیب ہوئی۔

معلوم ہے کہ خدا کے رسول اپنے اپنے زمانہ کیلئے بہترین معجزات کے حامل ہوا کرتے ہیں جن کا مثل لانے پر دوسروں کو قدرت نہیں ہوتی۔

اللہ جانتا تھا کہ نبوتِ محمدیؐ کے قیامت تک پھیلے ہوئے زمانہ میں انسان سرعتِ رفتار بڑھانے اور فضاؤں پر قابو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا اس لئے اس نے اپنے آخری نبیؐ کو ایک ایسا معجزۂ سرعتِ رفتار عطا فرمایا اور فضائے کائنات اور خلا کی لامحدود وسعتوں پر ایسا قابو دے دیا جو قیامت تک انسانی فکر کی پرواز کے لئے معجزہ بنا رہے گا۔ حضرت سید المرسلینؐ کی پیدائش نورِ خاص سے ہوئی۔ وہ مقصودِ کائنات تھے۔ اسی نور کی شعاعوں کے صدقہ میں عالم کی خلقت ہوئی اور کائنات پیدا ہوئی۔ ارشادِ الٰہی ہوا۔ "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" اے میرے

حبیب اکرم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو نہ پیدا کرتا۔ اسی نور کی چھوٹ سے ستاروں میں ضیاء آئی۔ اسی کے تصدق میں عالم کے بے جان ذرّوں میں زندگی کی اُمنگ ابھری تو پھر اس حاصل کائنات کے لیئے یہ کونسی حیرت انگیز بات تھی کہ وہ پلک جھپکتے ہی عرش تک پہنچ گیا۔ اللہ کے اس عظیم اعلان میں جو پہلا لفظ "عبد" ہے :۔ اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ لَیْلاً " وہ اپنے بندہ کو رات کے وقت لے گیا۔ اس سے اشارہ ہے کہ یہ جو کچھ بھی تھا وہ جلوۂ عبدیّت و بندگی ہی کا بلند ترین نمونہ تھا اور شاید یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہماری اطاعت و بندگی میں جو شخص جسقدر جھکتا ہے ہم اسی قدر اس کو رفعت اور بلندی عطا کرتے ہیں اور چونکہ ہمارا حبیب خاص، سیّد المرسلین اطاعت و بندگی میں عالمین میں سب سے زیادہ جھکا اس لیئے ہم نے اپنے حبیبؐ کو وہ بلندی اور وہ معراج عطا کر دی جو اوّلین و آخرین میں سے کسی کو بھی نہیں مل سکتی۔

مُساوات

مُساواتِ انسانی کا وہ اصول جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے انسان کی فطرت کا سب سے اہم تقاضا ہے اور اس قسم کی مساوات کسی دوسری قوم میں نہیں پائی جاتی۔ دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ کسی مُلک اور کسی خطّہ اور کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی اسی اصول کی بنیاد پر ہیں۔ آپس میں انکی جماعتی زندگی میں مرتبوں کی تقسیم کسی جائز طریقہ پر کیوں نہ ہو جیسے استاد، شاگرد، ماں باپ اور اولاد یا اسی طرح کی دوسری تقسیمیں لیکن بحیثیت مسلمان ہونے کے اور احکام خداوندی کے مخاطب ہونے کے سب کے سب ایک سطح پر ہیں یعنی اُن میں طبقاتی، لسانی، خطّہ وارانہ اور رنگ و نسل کا کوئی امتیاز موجود نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک کسی شخص کی بڑائی اور اہمیت کی بنیاد صرف اُس کا کردار اور حُسنِ سیرت ہے دوسری کوئی چیز نہیں۔ بادشاہ ہو یا فقیر ہو، امیر ہو یا غریب ہو۔ حاکم ہو

یا محکوم ہو، غلام ہو یا آقا ہو سب کے لئے یکساں طور پر احکام خداوندی پر عمل کرنا ضروری ہے اور سب کے سب خدا کے سامنے بلا امتیاز جوابدہ ہیں آنے والے محاسبہ کے دن یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ تم کس ملک کے رہنے والے تھے، کس خاندان سے تھے، کونسی زبان بولتے تھے اور کس قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

جب نماز جماعت قائم ہوتی ہے تو بڑے سے بڑے صاحب منصب اور امیر کبیر کے پہلو میں ایک غریب آدمی بھی کھڑا ہونے کا پورا حق رکھتا ہے اور اس حق سے دنیا کی کوئی طاقت اسے ناجائز طور پر محروم نہیں کر سکتی۔ حج میں جس مساوات کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ ملک ملک اور قوم قوم کے لوگ جمع ہوتے ہیں لیکن سب کا لباس ایک ہی طرح کا ہوتا ہے اور سب یکساں طور پر احکام حج بجالاتے ہیں جس میں اونچ نیچ کا کوئی فرق اور طبقاتی قسم کی تفریق نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم میں اللہ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات ۱۳) لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم ہی نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کر لو۔ اس میں شک نہیں کہ خدا

کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت والا وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبیلے اور خاندان تو صرف اس لیئے ہوا کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان سکے لیکن جہاں تک حقیقی عزت اور بندگی کا تعلق ہے وہ صرف نیک عمل سے ملتی ہے جس میں خاندان اور قوم وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ سرورِ کائنات نے ایک موقع پر فرمایا تھا جتنے مسلمان ہیں وہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں کسی کو کسی پر اگر فضیلت ہے تو صرف پرہیزگاری کے سبب سے۔ فتح مکہ کے وقت حضورؐ نے اعلان کیا تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ بِالْاِسْلَامِ نَخْوَۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَتَفَاخُرَھَا بِآبَائِھَا اَلَا اَنْتُمْ مِنْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ وَاِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ بیشک خدا نے اسلام کے ذریعہ سے زمانۂ جاہلیت کا غرور اور باپ دادا پر فخر کرنے کا جاہلانہ دستور مٹا دیا ہے تم سب کو یہ بات معلوم ہونا چاہیئے کہ تم سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا آدمی وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اسلامی مساجد کسی خاص طبقہ اور نسل کیلیئے مخصوص نہیں ہوتیں ہر ایک کو اُن میں نماز پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنیکا ہر مسلمان حق رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ انسان کا کوئی خاص

طبقہ اسے پڑھے اور دوسرے اس کی تلاوت سے محروم رکھے جائیں۔ جس طرح دنیا کی زندگی میں احکامِ شریعت شاہ و گدا سب کے لئے عام ہیں اسی طرح قیامت کے روز حساب و کتاب اور جزا و سزا میں بھی سب کے ساتھ بلا امتیاز نسل و قبیلہ عدل و انصاف ہوگا چاہے وہ دنیا میں امیر رہے ہوں یا غریب، فقیر رہے ہوں یا دولتمند حاکم رہے ہوں یا محکوم۔ اللہ کا ارشاد ہے۔ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ ط لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ط (المؤمن) آج کے دن ہر شخص کو اسکے کیئے کا بدلہ دیا جائیگا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔" دنیا میں ایسی قومیں بھی ملتی ہیں جہاں نسلِ انسانی کو طبقاتی صنفوں میں بانٹ دیا گیا ہے کوئی کتنا ہی نیک چلن ہو، کتنا ہی پڑھا لکھا ہو اور کیسے ہی بہترین صفات کا مالک ہو مگر وہ اپنی نسلی پستی سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ لیکن اسلام نے ایسی کوئی تقسیم جائز نہیں رکھی اور کسی انسانی فرد کو اُس کے جائز انسانی حقوق سے محروم نہیں ہونے دیا مسلمانوں میں کوئی نیچ قوم نہیں ہوتی۔ سب اللہ کے بندے ہیں۔ سب آدمؑ کے فرزند اور سب انسانیت اور اس کے حقوق میں برابر کے شریک ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ قیامت کے دن فرمائیگا کہ جن باتوں کا میں نے تمھیں حکم دیا تھا اور جو کچھ میں نے تم سے عہد کیا تھا کہ تم میری اطاعت کرنا اور میرے حکم کو ماننا۔ اس پر تم نے عمل نہ کیا اور اس عہد کو ضائع

تبرباد کر دیا اور بجائے عمل صالح کے اپنے نسبوں، اپنے نسبوں اور اپنے خاندانوں پر اکڑنے لگے اور میری اطاعت کو بھول گئے تو آج قیامت کے دن میں اپنے انتساب یعنی اپنی طرف نسبت اور اپنی ذات کے تعلق اور رابطہ کو بلندی عطا کر دوں گا اور جس شخص کو میری ذات سے اطاعت و عمل کی نسبت حاصل ہے اُسی کو عزت دونگا اور تمہارے قائم کیئے ہوئے نسبوں کو گرا دوں گا پھر آواز آئے گی: اَیْنَ الْمُتَّقُوْنَ! صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگار لوگ کہاں ہیں! قرآن حکیم نے جس اخوتِ اسلامیہ کا اعلان کیا ہے اُس کی رو سے ہر وہ شخص جو کلمۂ اسلام پڑھتا ہے وہ دوسرے مسلمانوں کا بھائی ہے اور دینی اخوت خاندانی اخوت سے بہت زیادہ مستحکم اور بہت زیادہ گہری اور وسیع ہوتی ہے۔ اس میں نہ گورے کی شرط ہے نہ کالے کا امتیاز ہے اور نہ شیخ اور سیّد کا فرق ہے اور نہ ملک و خطّہ یا زبان کی تفریق ہے۔ جو مسلمان ہے وہ جہاں بھی اور جس حال میں بھی ہے ہمارا دینی بھائی ہے اور اس کی عزّت کرنا، اسکی حفاظت و حمایت کرنا اور اس سے ہمدردی کرنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے اور اسے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی بھی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔

کسی مسلمان کیلئے دوسرے مسلمان کی بے عزتی اور تحقیر کرنا اور

اسے نقصان پہنچانا، اس بنیاد پر کسی طرح جائز نہیں ہے کہ وہ فقیر ہے یا دنیاوی جاہ و حشم سے محروم ہے۔ عزت اور بے عزتی کا اصلی معیار صرف کسی شخص کا نیک عمل اور اس کی بدکرداری ہی ہو سکتی ہے دوسری کوئی چیز نہیں۔ غرض سچا مسلمان صرف وہ ہے جو دوسرے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے اور ان کی مصیبتوں اور خوشیوں میں برابر کا شریک رہے۔ اسکے برخلاف جو نسل و رنگ اور دوسری قسم کی تفریقیں کرے گا اور ملتِ اسلامیہ کو طبقاتی ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش کریگا وہ قرآن و حدیث کا منکر ہے اور اس راستہ پر نہیں ہے جو اسلام نے بتایا ہے۔ مسلمانوں کی دینی و دنیوی ترقی و فلاح صرف اسی بات میں ہے کہ وہ ہر قسم کی تفریق مٹا کر آپس میں اسلامی مساوات پر قائم ہوں اور ایک مضبوط چٹان کی طرح متحد ہو جائیں۔

اتحاد و اتفاق

کسی معاشرہ کی زندگی، ترقی اور بقا صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب اس کے افراد آپس میں متحد و متفق ہوں دوسرے الفاظ میں کسی قوم کا باہمی اتحاد و اتفاق ہی اس کی زندگی ہے اور اس کا انتشار افراد اور جماعت دونوں ہی کی موت ہے۔ سرور کائنات کی بعثت کے وقت عربوں میں جو آپس کی نا اتفاقیاں پھیلی ہوئی تھیں وہ تاریخ کا ہر پڑھنے والا جانتا ہے۔ ان کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا تھا۔ ایک ایک خون کا عوض کئی کئی پشتوں تک لیا جاتا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر برسوں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور انسانی خون پانی کی طرح بہتا تھا۔ کوئی شخص بھی امن کی زندگی نہیں بسر کر سکتا تھا۔ اس کے لیئے ہر لمحہ اور ہر قدم خطروں اور خوف سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جب زندہ رہنا اور سکون و اطمینان کی سانس لینا ہی دشوار ہو تو کوئی فرد یا قوم کس طرح علوم و فنون کو حاصل کر سکتی ہے۔ وہ شاخ جو ہوا کے جھکڑوں اور طوفانوں کے تھپیڑوں سے لرز رہی ہو اس پر آشیانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ بس

یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ جب تک امن و امان نہ ہو روح اور جسم کی حفاظت ممکن نہ ہو۔ پھر اُس کے لیے باقی رہنا اور ترقی کرنا کیونکر ممکن ہوگا۔ غرض بعثتِ رسول اللہ کے وقت عرب کا خطہ جھگڑوں اور فسادات سے بھرا ہوا تھا اور ہر طرف لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ کسی شخص کی بھی جان، مال، عزت اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ رسولِ کریم تشریف لائے اور اپنے ساتھ خاندان اور قوم و ملک کے رشتوں کے ساتھ ان تمام رشتوں سے بڑھ کر ایک ایسا رشتہ لائے جس نے پوری عرب قوم کی ذہنیت ہی بدل دی۔ یہ رشتہ دین کا تھا۔ جس نے اُن بھائیوں کو جو ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے پھر سے ملا دیا بلکہ جن لوگوں میں کوئی بھی خاندانی اور قبائلی یا نسل و رنگ اور ملک اور خطہ کا باہمی رشتہ نہ تھا ان کو بھی آپس میں متحد کر دیا اور ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا، یہ اسلامی برادری کا رشتہ تھا جس میں دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں اور ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات کے راز پوشیدہ تھے۔

اس اسلامی برادری کے رشتہ نے ہر شخص کے دل میں محبت کی ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کی باہمی عداوتوں کو مٹا دیا اور اُن کے دلوں سے ان دشمنیوں کو اس طرح بھلا دیا کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے کو قاتلوں کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے آپس میں

بھائی بھائی بن گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو خدا کا یہ پیغام سنایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا

(آل عمران ۱۰۳)

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو۔ اس طرح جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور تمھیں موت نہ آئے مگر ایسی ہی حالت میں کہ تم سچے مسلمان ہو اور (دیکھو) تم سب کے سب ملکر رشتہ الٰہی کو مضبوط تھام لو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔ پھر سورۃ انفال میں ہے: آیہ ۶۳

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ اللہ نے مسلمانوں کے دل آپس میں ملا دیے اگر تم زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب خرچ کر دیتے

جب بھی تم ان کے دلوں کو ملا نہ سکتے" مگر اللہ نے اُن کے دلوں کو ملا دیا بے شک وہ ہر چیز پہ غالب ہے اور مصلحت جاننے والا ہے"۔

اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کی بنیاد جس قانون خداوندی پر ہے اس کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس نعمت اتحاد سے فائدہ حاصل کیا جائے کیونکہ یہی واحد راستہ ہے جس میں انسانی معاشرہ کی بہبود و فلاح ممکن ہے سورۂ انفال میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے (انفال ۴۶) وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ الآیۃ)

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑے نہ کرو (یعنی پورے اتفاق و اتحاد کے ساتھ زندگی بسر کرو) کیونکہ اگر تم آپس میں متحد نہ رہو گے تو ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔

اسی آپس کے اتحاد پر اسلامی معاشرہ کی پوری عمارت قائم ہے اگر اس میں ذرا سا بھی فرق آ گیا تو ملت اسلامیہ کی ساکھ ختم ہو جائیگی اور وہ اپنی حیثیت کھو بیٹھے گی جو اسلام کی بدولت اُسے حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے سامنے دنیا کی گذشتہ تاریخ بھی ہے اور اس وقت کے حالات بھی ہیں جب ہم ان تاریخی قدروں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اس حقیقت کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ اتحاد و اتفاق ہی

کسی قوم اور کسی جماعت کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ اور اس کا منتشر ہی اس کی فنا اور موت ہے۔ جو قومیں منتشر ہو جاتی ہیں وہ اپنی زندگی کے تمام حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں اور جن میں آپس کا اتحاد و اتفاق ہوتا ہے خواہ وہ تعداد میں کتنی ہی کم ہوں لیکن انھیں دوسرے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس حقیقت کا ایک ناقابل انکار ثبوت اور ایک عظیم مثال ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس کی وجہ سے مدینہ کے قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کی آپس کی دشمنی جو ایک صدی سے زیادہ زمانہ سے چلی آرہی تھی یگانگت اور اخوت و محبت میں بدل گئی اور وہ دشمن اور قاتل کے بجائے ایک دوسرے کے بھائی اور دوست بن گئے۔ سرورِ کائنات نے آپس کے اتحاد کی قوت اور اس کے فلسفہ کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ کبھی اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ سارے مسلمان آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرنے اور محبت کرنے میں ایک جسم کی مثال ہیں کہ اس کے ایک عضو میں اگر تکلیف ہوتی ہے تو اس کے دوسرے اعضاء خود بخود تکلیف محسوس کرنے لگتے ہیں بس یوں ہی اسلامی معاشرہ بھی ایک بدن کی طرح ہے۔ اسکے افراد اس کے اعضا ہیں۔ اس کی بھی حالت ایسی ہی ہونا چاہیئے کہ اگر ایک فرد کو تکلیف ہو تو سارا معاشرہ اس دکھ کو محسوس کرے اور اسے دفع کرنے کی کوشش کرے

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا تھا - مسلمان آپس میں متحد و متفق ہو کر اس طرح قوت و طاقت حاصل کرتے ہیں جیسے دیوار کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے مل کر مضبوط بنتا ہے - یہ فرما کر آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کس طرح یہ دونوں ملکر ایک نئی طاقت حاصل کر لیتی ہیں جو اس اتحاد کے بغیر ان میں نہ تھی اس کے بعد نبیؐ کریم نے فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر آخر میں ناقابل تسخیر بن جاتی ہے اور بڑے بڑے ہتھیار ان دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اسی طرح مسلمان قوم بھی ایک قلعہ ہے جس کی ہر اینٹ ایک ایک مسلمان ہے - یہ قلعہ اسی وقت تک ناقابل تسخیر بنا رہے گا اور ہر خطرہ سے محفوظ رہیگا جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے اگر یہ اینٹیں اپنی اپنی جگہ سے کھسک کر الگ ہو جائیں گی اور ان کا آپس کا میل اور اتحاد باقی نہ رہے گا تو یہ پورا قلعہ زمین پر آ رہے گا -

قرآن مجید کے سورۂ صف میں اسی اتحاد اتفاق کے نظریہ کو "بنیانٌ مرصوص" کے جملہ میں سمجھایا گیا ہے -

اللہ کا ارشاد ہے : اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ

صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ" (توبہ ۴ر۴)

بیشک اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح مل کر اور صف بندی کے ساتھ جہاد کرتے ہیں جیسے کہ وہ سیسہ کی مستحکم دیوار ہیں" - یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو گہرے اتحاد اور آپس کے میل جول اور یک جہتی اختیار کرنے کی ہدایت ہے - اس قتال "فی سبیل اللہ" کے جملہ میں "قتال" اور "سبیل اللہ" دونوں لفظوں کا مفہوم اس پورے جد و جہد زندگی کو گھیرے ہوئے ہے جو مسلمانوں کی حیات کا سب سے بڑا مقصد ہے اور اس طرح یہ لڑائی کے چند محدود میدانوں ہی میں نہیں بلکہ نیکی کے ہر راستہ اور دینی اقدار کے ہر تقاضے پر یکجہتی اور اتحاد و یگانگت اور باہمی اخلاص و اخوت و محبت کی تعلیم ہے اور اللہ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ آپس میں متحد رہیں اور رشتۂ محبت میں اس طرح جڑے رہیں جیسے فولادی مضبوط اور مستحکم دیوار ہوتی ہے کہ اُس میں کہیں بھی کوئی خلا نہیں ہوتا - اس کے سارے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر ایک جان، ایک روح اور ایک جسم بن جاتے ہیں درحقیقت یہ آپس کا اتحاد جہاں ایک پوری قوم اور پورے معاشرہ کی نجات و فلاح و ترقی کی ضمانت ہے ساتھ ہی اس معاشرے کے

افراد کی بہبود اور زندگی و ترقی کی بھی بہت بڑی بنیاد ہے۔ بہت سے لوگ اپنے ذاتی فائدہ پر قوم اور جماعت کے مفاد کو قربان کر دیتے ہیں اور شاید وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ قوم و ملت کا فائدہ ان کا فائدہ نہیں ہے لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو افراد کا مفاد اور جماعت و قوم کا مفاد الگ الگ باتیں نہیں ہوتیں بلکہ معاشرہ کے فائدہ ہی سے فرد کا مفاد بھی وابستہ ہوتا ہے ہر فرد کی خواہشات دوسرے فرد کی خواہشوں سے جدا ہوا کرتی ہیں اس طرح اگر افراد کے انفرادی تقاضوں کے سامنے قومی مفاد کو پیچھے ڈال دیا جائے تو پھر قوم کا وجود فنا ہو جائے گا اور جب قوم ہی نہ رہے گی تو افراد بھی خود بخود فنا ہو جائیں گے اس لیے افراد کی عزت، وقار، زندگی، ترقی و فلاح اور امن و سکون سب کچھ معاشرہ اور قوم و ملت کے تحفظ و استحکام ہی پر منحصر ہے جو بغیر آپس کے مکمل اتحاد و اتفاق کے ممکن نہیں ہو سکتا۔ بیشک اس اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرنے والے اور قومی شیرازہ بندی میں انتشار پھیلانے والے اسلام کی اس روح سے بے خبر ہیں جو الٰہی تعلیمات کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔

۷۸۶

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن

تاریخ کے ہر دور میں جب بدی کی قوتیں ابھریں اور طاغوتی لشکر صف آرا ہوئے تو ان سے ٹکر لینے کے لیئے کچھ ایمانی طاقتیں بھی سامنے آتی رہیں اور اپنے یقینِ محکم اور جذبۂ حق پرستی سے اُن کا مقابلہ کرتی رہیں اور انھیں شکست دیتی رہیں اور اسطرح انھوں نے ناموسِ حق کی حفاظت کا حق ادا کیا اور اس راہ میں کبھی انھوں نے اپنی جان و مال، عزت و آبرو، اولاد اور منصب و دولت کسی چیز کی بھی پرواہ نہ کی اور اس ایمانی فرض کو انجام دیا جو اللہ کی طرف سے اُن پر عائد ہوتا تھا بلاشبہ اسلام دینِ الٰہی ہے اور یہی انسانی فلاح کا واحد ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اس لیئے اس کا زوال انسانیت کی بربادی اور اس نظامِ ہدایت کی تباہی کے مترادف ہے جو اللہ نے انسانی فلاح کے لیئے مقرر فرمایا ہے اسی لیئے یہ ضروری تھا کہ اللہ کی طرف سے اُس کے دین اور اُسکے نظامِ ہدایت کے تحفظ کے لیئے ہمیشہ ایسی شخصیتیں ابھرتی رہیں

جو ایک لمحہ کے لیئے بھی باطل کے سامنے سر اطاعت خم نہ کر سکیں اور بنی نوع بشر کی بقا اور خوشحالی اور دنیوی و اخروی فلاح و نجات کے اس واحد وسیلہ کو مٹنے سے بچا لیں۔ انسانی تاریخ حق و باطل کی ٹکروں کے بے شمار واقعات اپنے دامن میں لیئے ہوئے ہے ان واقعات میں بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے جب حق کی طاقتوں نے باطل کی صفوں کو مادّی شکست بھی دی اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ حق پرست طاقتوں کو مادّی شکست اور مادّی مغلوبیت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہاں اس حقیقت کو ہمیشہ ہمیں اپنے سامنے رکھنا چاہیئے کہ حق و باطل کی جنگیں جب بھی ہوئیں وہ اصول کی جنگیں تھیں اور نظریات کی لڑائیاں تھیں۔ اصول و نظریات کی لڑائیوں میں مادّی غلبہ اور جغرافیائی فتوحات کی کوئی قیمت ہی نہیں ہوا کرتی درحقیقت اس قسم کی جنگوں میں فتح اور کامیابی کا اصلی معیار اس مقصد کا حصول اور اس مقصد کی کامیابی ہوتی ہے جس کے لیئے کوئی فریق ایسی جنگ لڑتا ہے۔ دینی اور توحید پرست طاقتوں کی جنگ کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ دنیا والے حق کو پوری طرح پہچان لیں اور باطل کے چہرہ پر حق کی نقاب اور حق کے چہرہ پر باطل کا پردہ نہ ڈالا جا سکے اور اس نقطۂ نظر سے تو اہل حق ہمیشہ کامیاب رہے

اور جب کبھی حق و باطل کا ٹکراؤ ہوا انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور کبھی باطل کی قوتیں حق پرستوں سے ان کی اس فتح کو چھیننے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ مادی فتوحات کے پجاریوں نے اس خیالِ خام میں کہ کسی کو قتل کر دینا اور اسیر کر لینا ہی ان کی فتح کی علامت اور دوسرے کی شکست کی نشانی ہے، اہلِ حق پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے اور ان کے خونِ ناحق سے زمین کو رنگ دیا۔ مگر ظالم قوتوں کو کبھی اس کا اندازہ نہ ہوا کہ ان کا ظلم جسقدر بڑھتا گیا، انکی شکست یقینی اور دائمی ہوتی گئی اور اہلِ حق کا جس قدر خون بہتا گیا اور ان کی متاعِ حیات لٹتی رہی اسی قدر اُن کے مقصد میں استحکام پیدا ہوتا گیا۔ ظالم شیطانی طاقتیں مظلوم ایماندار وں کے خون سے کھیلتی رہیں اور اپنے فاتح ہونے کا خواب پریشاں دیکھتی رہیں مگر آنے والی تاریخ ان پر مسکراتی رہی اور انھیں جھٹلاتی رہی کہ تم ہرگز اصلی فاتح نہیں ہو بلکہ اصلی اور حقیقی فاتح وہ شہیدانِ راہِ خدا ہیں جنہوں نے اپنی پاک زندگی کا ایک ایک لمحہ حفاظتِ حق میں صرف کر دیا اور اپنے مقدس لہو کی آخری بوند بھی ناموس اسلام کی حفاظت میں کبھی عزیز نہ رکھی۔ حق و باطل کی آویزش کی طویل تاریخ کے ایک یادگار موڑ پر یہی شیطانی طاقتیں یزید لعین کے روپ میں ابھری تھیں اور

پوری شدت کے ساتھ حق کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں اور دوسری طرف حق پرستی نواسۂ رسولؐ حضرت سید الشہداء حسینؑ بن علیؑ کے لباس میں تھی - یہ ۶۱ھ کا زمانہ تھا جب عاشورِ محرم کو حق و باطل کی جنگ ہوئی - یہ بات ممکن ہی نہ تھی کہ امام حسینؑ دنیا میں موجود ہوتے اور دین خدا کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھتے رہتے اور اس کے تحفظ کے لیے کوئی اقدام نہ کرتے - اپنی زندگی اور راحت و آرام کو اسلامی مفاد پر مقدم کر دیتے اور یزیدی آمریت و ملوکیت کے جارحانہ حملوں سے انسانی اور اسلامی اقدار کا بچاؤ نہ کرتے اور اسلام کی فریاد پر توجہ نہ کرتے - امام حسینؑ نے اسلام اور حق و دیانت کی فریاد پر لبیک کہی، اپنے فرض کا بھرپور احساس فرمایا اور جو کچھ بھی اُن کے قبضہ میں تھا - اُسے اپنے ساتھ لیکر کربلا کے ریگستان کی طرف روانہ ہو گئے -

یہ بڑا ہی امتحانی اور آزمائشی وقت تھا جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری اصلاحی کوششیں اور پوری تبلیغی محنت برباد ی کے دہانے پر آچکی تھی - اسلام کے بدترین دشمن اپنے نجس چہروں پر حق کی نقاب ڈال کر اس کی جڑیں کاٹ رہے تھے - لات و عزیٰ کے پرانے پجاری توحید کی بنیادیں ہلا رہے تھے، تکبیر کی صدائیں چنگ و رباب کے نغموں سے دبائی جا رہی تھیں - ذکرِ خدا کی محفلوں اور وعظ و نصیحت کے

تذکروں کے بجائے آمریت و ملوکیت کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے، آلؑ و اصحابِ رسولؐ کا خون تک مباح کر دیا گیا تھا۔ یزید لعین اپنی ملوکیت اور آمریت کے نشہ میں چور ہو کر یہ نعرہ لگا رہا تھا کہ:

"لَعِبَتْ ھَاشِمُ بِالْمُلْکِ فَلَا خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَلْ"، یعنی بنی ہاشم (معاذ اللہ) ملک و دولت کا ایک کھیل کھیلے تھے نہ تو کوئی وحی اتری تھی اور نہ خدا کا کوئی کلام اور پیغام آیا تھا۔ حضرت سید الشہداءؑ نے ایسے ہولناک وقت میں اور ایسی آزمائشی گھڑی میں وہی کیا جو اُن کی بحیثیت نواسۂ رسولؐ کے ذمہ داری تھی۔ کوفہ والوں نے ہزار ہا خطوط بھیجے کہ ہماری ہدایت کے لیے تشریف لائیے امامؑ عالی مقام نے ان کی دعوت کو قبول کیا اور کوفہ کے قریب سر زمین کربلا پر آ گئے۔ آپ نے بارہا فرمایا تھا کہ میں عیش و طرب اور ملوکیت و سلطنت کی خواہش لیکر یہ سفر نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری غرض صرف اسقدر ہے کہ اپنے نانا کی اُمت کی ہدایت کر دوں۔ محرم ۶۱ھ کے نو دن بھی گذر گئے پھر وہ رات آئی جس کی صبح۔ صبحِ قیامت سے کسی طرح کم نہ تھی زمانہ کے قدم کچھ اور آگے بڑھے! صبحِ عاشورہ کے خونین سورج نے اُفقِ مشرق سے اپنا سر بلند کیا۔ مردانِ حق نے میدانِ شہادت میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں پھر بوڑھے سورج نے شہیدوں کا لہو

کربلا کی جلتی ہوئی ریگ پر گرتے ہوئے دیکھا، عورتیں بیوگی کی آزمائش میں مبتلا ہونے لگیں، ماؤں کی گودیں خالی ہونے لگیں۔ بچے یتیم ہونے لگے اور تین دن کے بھوکے پیاسے پرستارانِ حق جام شہادت نوش کرنے لگے۔ آخر آسمان کی نیلگوں آنکھوں نے وہ وقت بھی دیکھ لیا جب حسینؑ کا چھ مہینہ کا بیٹا علیؑ اصغر دشمن کے تین بھال کے زہریلے تیر کا خود حسینؑ کی گود میں نشانہ بن گیا اور نازک گلے پر تیر کھا کر بچہ نے باپ کو دیکھا اور پھر مسکرا کر باپ کے گلے میں اپنے چھوٹے ہاتھ ڈال دیئے اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حسینؑ نے بچہ کے خون کو چلو میں لیکر اپنے چہرہ پر ملا اور پھر لاش علیؑ اصغر لا کر خیمہ میں مادر علیؑ اصغر حضرت رُبابؑ سے فرمایا "تم اپنے بچہ کو لے لو! اب یہ تم سے پانی کبھی طلب نہیں کرے گا"! اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب امامؑ عالی مقام کا سر اقدس نیزہ پر بلند تھا اور یزیدی فوج فتح کے باجے بجا رہی تھی۔ آج عاشور محرم ہے ۶۱ھ میں یہی تو دن تھا جب حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے مقدس لاشے صحرائے کربلا میں بے گور و کفن پڑے تھے۔ خیام آلِ رسولؐ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یزیدؔ اپنی فتح پر نازاں تھا مگر آنے والی تاریخ اسے جھٹلا رہی تھی کہ تو ہرگز فاتح نہیں ہے! فاتح تو وہ حسینؑ ہیں جنہوں نے شہید ہو کر حق و صداقت اور اسلام کی لاج

رکھ لی اور سچائی کا عَلَم قیامت تک کے لیئے بلند کر دیا، یزیدی
آمریت کے جنازہ کو رسوائی کے گہرے غار میں دفن کر دیا اور اولادِ
آدمؑ کے ضمیر کو وہ روشنی دے دی جسے لاکھوں یزید ملکر بھی
اب کبھی نہیں بجھا سکتے اور اپنے خون سے انسانیت کی لوحِ شعور
پہ تحریر کر گئے کہ سچے مؤمن کا مَطلوب و مَقصود مادّی سلطنت
و اقتدار نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اس کا مَطلوب و مَقصود راہِ خدا
میں قربانی اور شہادت کی لازوال عزّت کا حصول ہوتا ہے ۔
وَسَيَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَىَّ مُنۡقَلَبٍ يَّنۡقَلِبُوۡنَ ۝ (سورۃ الشعراء/۲۲۷)

۴۸٦

بنائے لا الٰہ الا اللہ

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی عظیم قربانی کے ذریعہ سے جو کربلا کے میدان میں پیش ہوئی حق کو باطل سے پوری طرح الگ کر دیا کسی دلیل سے وہ بات حاصل نہ ہوئی جو آپ کے اس عمل سے حاصل ہوئی۔

امام حسینؑ نے راہ حق دکھانے میں ہر وہ ممکن اقدام کیا جو کوئی انسان کر سکتا تھا اور ہر مصیبت پر انتہائی بہادری کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ نواسۂ رسولؐ تھے۔ حضرت علیؑ کے لخت جگر اور جناب فاطمہ زہراؑ کے نور نظر تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اس نواسہ کو اپنی زبان چسا کر پالا تھا اور اپنی آغوش تربیت میں پرورش فرمایا تھا۔ حسینؑ اپنے نانا کی تصویر تھے۔ آپ کے اخلاق اور عادات پیغمبر اکرمؐ کا آئینہ تھے۔ اسلام پر وہ وقت بہت دشوار تھا جب اس کا رسولؐ کے ہاتھوں، مکہ میں آغاز ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں حضرت سرورؐ کائنات کو جن تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا

وہ تاریخ کا ایک خونین باب ہیں مگر اسلام کے لیئے وہ وقت بھی کسی طرح اپنی دشواری اور ہولناکی میں کم اہمیت کا حامل نہ تھا جب رسولِ اکرم کی تیئس ۲۳ سال کی محنت و جانفشانی تباہی اور بربادی کے دروازہ پر پہنچ چکی تھی۔ جب اسلام کی نقاب ڈال کر اس کے بدترین دشمن اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ جب اسلامی روپ میں لات و عزیٰ کے پرستار توحید کی بنیادوں کو ہلا رہے تھے جب دربارِ حکومت فواحش کا اڈا بن چکا تھا اور یزید کی جنسی ہوس سے اس کے محارم بھی محفوظ نہ تھے جب اذان کی صدائیں رقص و سُرود کے نغموں اور گھنگرو کی آوازوں میں دب چکی تھیں۔ ہدایت و ارشاد اور پند و نصیحت کی محفلوں کے بجائے شرابِ ناب کی بزم میں آراستہ تھیں اصحابِ رسولؐ کی توہین کرنا، ان کی تکذیب کرنا اور ان کا خون بہانا جائز بنا دیا گیا تھا۔ اہل بیتؑ کرام کی بے عزتی کی گئی اور جو اُن کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ ان حالات میں ایک سچے موحد اور ایک مخلص مسلمان کا کیا فریضہ تھا اور اعلائے کلمۃ الحق میں اس کو کیا کرنا چاہیئے تھا۔ کیا ایسے وقت میں خاموش بیٹھا رہنا اور اپنی جان و مال اور اپنے گھر والوں کی حفاظت و سلامتی کو اسلام کی بقا پر مقدم رکھنا اسلامی نقطۂ نظر

سے صحیح تھا۔ ہرگز نہیں۔ حسینؑ نے وہی کیا جو ان کا فرض تھا اور جو ایسے نازک وقت میں اُن کو کرنا چاہیئے تھا، کوفہ کے لوگوں نے آپ کے نام ہزار ہا خطوط روانہ کئے تھے جن میں نواسۂ رسولؐ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ وہاں تشریف لے جاکر مسلمانوں کی ہدایت فرمائیں اور ان کو یزیدؔ کی فحش کاریوں سے نجات دلائیں۔ بڑے بڑے مشہور مسلمانوں کے اُن خطوط پر دستخط موجود تھے جن میں بعض اصحاب رسولؐ بھی شامل تھے۔ ان درخواستوں میں یہ الفاظ موجود تھے:

اِنَّهٗ لَيْسَ عَلَيْنَا اِمَامٌ فَاَقْبِلْ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يَّجْمَعَنَا بِكَ عَلَى الْحَقِّ وَالْهُدٰى۔

ہمارے لیئے یہاں کوئی ہدایت کرنے والا موجود نہیں ہے جو ہمیں صحیح اور درست راستہ دکھا سکے آپ تشریف لائیے۔ خدا آپ کی ذات کے ذریعہ سے ہم سب کو ہدایت اور حق پہ جمع کر دے گا۔

امام حسینؑ نے ان کثیر خطوط کا جو جواب دیا تھا اس میں یہ لکھا تھا: قَدْ فَهِمْتُ كُلَّ الَّذِىْ اقْتَصَصْتُمْ وَذَكَرْتُمْ وَمَقَالَةُ جُلِّكُمْ اِنَّهٗ لَيْسَ عَلَيْنَا اِمَامٌ فَاَقْبِلْ وَاَنَا بَاعِثٌ اِلَيْكُمْ اَخِىْ وَابْنَ عَمِّىْ

وثقتی من اہلبیتی مسلم بن عقیل فان کتب الی انہ قد اجمع رأی ملاءکم و ذوی الحجیٰ والفضل منکم علیٰ مثل ما قدمت بہ رسلکم و قرأت فی کتبکم فانی اقدم الیکم وشیکاً انشاء اللہ فلعمری ما الامام الا الحاکم بالکتاب القائم بالقسط الدائن بدین الحق الحابس نفسہ علیٰ ذلک للہ والسلام۔

میں اس بات کو پوری طرح سمجھ گیا جو آپ لوگوں نے لکھی ہے کہ ہماری ہدایت کے لیے کوئی امام اور حاکم موجود نہیں ہے۔ تو میں اس کے جواب میں اپنے بھائی اور اپنے چچا کے بیٹے اور اپنے خاندان کی ایک معتمد اور قابل وثوق فرد مسلم بن عقیلؑ کو آپ کے پاس روانہ کرتا ہوں، اگر انھوں نے مجھے لکھا اور اس کی اطلاع دی کہ آپ کے صاحبانِ فضل اور اہل الرائے اس معاملہ میں پوری طرح متحد ہیں اور اُن میں کسی قسم کا اختلاف موجود نہیں ہے جیسا کہ ان درخواستوں میں آپ نے ظاہر کیا ہے تو میں بہت جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔

بلاشبہ امام تو صرف وہی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق احکام نافذ کرتا ہو، جو عدل و انصاف اور دینِ حق پر قائم ہو اور صرف خوشنودی خدا کے لیے احکامِ الٰہی کا پابند ہو۔

مکہ کے ایک بڑے جلسہ میں اپنی روانگی عراق سے ایک روز قبل امام حسینؑ نے جو خطاب فرمایا تھا اس میں یہ الفاظ بھی تھے:

خُطَّ الموتُ علیٰ وُلدِ آدمَ مَخطَّ القلادۃِ علیٰ جیدِ الفتاۃِ وما اولھنی الیٰ اسلافی اشتیاقَ یعقوبَ الیٰ یوسفَ وخیّر لی مصرعٌ انا لاقیہِ کانّی انظرُ الیٰ اوصالی یتقطّعھا عسلانُ الفلواتِ بینَ النّواویسِ وکربلاءَ فیملئنَّ منّی اکراشاً جوفاً واجربۃً سغباً لامحیصَ عن یومٍ خُطَّ بالقلمِ رضا اللّٰہِ رضانا اھلَ البیتِ نصبرُ علیٰ بلاءہٖ ویوفّینا اجرَ الصّابرینَ ومن کانَ باذلاً فینا مھجتہٗ موطّناً علیٰ لقاءِ اللّٰہِ فلیرحل معنا فانّی راحلٌ مصبحاً انشاء اللّٰہ تعالیٰ۔

موت اولادِ آدمؑ کے گلے کا ہار ہے۔ مجھے اپنے اسلاف سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے اور یہ شوق ویسا ہی ہے جیسا یعقوبؑ کو یوسفؑ کی ملاقات کا تھا۔ میرے لیئے وہی خواب گاہ پسند کی گئی ہے جہاں میں جانے والا ہوں، گویا میں اپنے بدن کے حصّوں کو دیکھ رہا ہوں جنکو نواویس اور کربلاء کے درمیان درندہ خصلت وحشی اور ظالم دشمن ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ اور اپنے اس عمل سے اپنے ظلم وجور کی بھوک کو دور کر رہے ہیں جس کو قلمِ تقدیر سے لکھدیا گیا ہے اس دن سے کسی کو چھٹکارا

ممکن نہیں - جو خدا کی مشیت ہے وہی ہم اہل بیتِ رسولؐ کی مرضی ہے ہم کو مصیبتوں پر صبر کرنا ہے - اس کے بعد آپ نے فرمایا: جو شخص ہماری راہ میں اپنی جان فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر کس چکا ہو وہ ہمارے ساتھ روانہ ہو جائے کیونکہ میں انشاء اللہ کل صبح کوچ کے لیئے روانہ ہو جاؤں گا۔ امامؑ عالی مقام نے ایک خط اہل بصرہ کے نام بھی تحریر فرمایا تھا جس میں لکھا تھا: أَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى اللّٰهِ وَنَبِيِّهِ فَإِنَّ السُّنَّةَ قَدْ أُمِيتَتْ - میں آپ لوگوں کو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ سنتِ نبویؐ اب تباہ ہو چکی ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے دنیا کی ہر راحت کو دین کی تبلیغ اور اسلام کی بقاء کے لیئے ترک کر دیا تھا اور وہ اس راہ میں ہر چیز یہاں تک کہ اپنی محبوب اولاد کو بھی قربان کرنے کے لیئے تیار رکھتے ان کا مقصد اصلاح تھا اور ہدایتِ خلق - ان کے دل میں ملک گیری کی ہوس نہ تھی وہ سلطنت و تاج و تخت کے خواہشمند نہ تھے اگر ان کی غرض دنیا ہوتی تو وہ یزید سے اختلاف نہ کرتے اور خاطر خواہ شرائط کے ساتھ اس کی بیعت کر لیتے جو بہت آسان امر تھا اور اس کے نتیجہ میں امام حسینؑ کو کثیر دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔

مگر آپ نے دینِ خدا کی حفاظت کی راہ میں کسی راحت و آرام کی پروا نہ فرمائی اور کسی دھمکی سے مرعوب نہ ہوئے اور اُس فرض کو پورا کیا جو اسلام اور دیانت کی طرف سے اُن پر عائد ہوتا تھا۔ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد بن حنفیہؒ کو چلتے وقت جو وصیت فرمائی تھی اس میں فرمایا تھا:

اِنِّی لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّلَا بَطِرًا وَّلَا مُفْسِدًا وَّلَا ظَالِمًا وَّاِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّۃِ جَدِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْھٰی عَنِ الْمُنْکَرِ وَاَسِیْرَ بِسِیْرَۃِ جَدِّیْ وَاَبِیْ عَلِیِّ ؑ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ؑ فَمَنْ قَبِلَنِیْ بِقَبُوْلِ الْحَقِّ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِالْحَقِّ وَمَنْ رَدَّ عَلَیَّ ھٰذَا اَصْبِرُ حَتّٰی یَقْضِیَ اللّٰہُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَھُوَ خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ۔"

یعنی میں عیش و راحت کی ہوس میں اور ظلم و فساد کی خواہش لئے کر یہ سفر نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنے نانا کی امت کی ہدایت کروں۔ انھیں برائیوں سے منع کروں اور وہی طریقہ اختیار کروں جو میرے نانا حضرت رسالتمآبؐ اور بابا علیؑ مرتضیٰ کا تھا اور ان کی سیرت پر چلوں اس کے بعد جو میری بات کو حق جان کر قبول کرے گا تو اس کو ہدایت حاصل ہوگی اور جو میری بات کو رد کرے گا تو میں اس پر صبر

کروں گا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور اس قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائیگا"

عاشور کی صبح نزدیک ہے۔ شب کا ہیبتناک سنّاٹا صحرائے کربلا پر چھایا ہوا ہے۔ بچّے پیاس اور بھوک سے بے حال پڑے ہیں، انصار و اہل بیتؑ کے مقدّس خیموں سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں آرہی ہیں۔ ادھر ابن زیاد کی سفّاک فوجیں ان چند مٹھی بھر پاکباز انسانوں کو محاصرہ میں لیئے ہوئے ہیں اور ان کا پاک خون بہانے کے لیئے بیچین ہیں۔ ایک طرف شوقِ ظلم ہے، خواہش اقتدار ہے، ہوس ملک و دولت ہے، نشہ و غرور سلطنت ہے، دنیا پرستی اور خدا فراموشی ہے اور دوسری طرف شوقِ شہادت ہے، خواہش خدمت ہے جذبۂ عبادت و اطاعتِ الٰہی ہے۔ خدا پرستی اور دینداری ہے۔ ہر طرف سکوت ہی سکوت ہے۔ خوف و دہشت نے ساحل فرات سے ہر ذرّہ کو گھیر لیا ہے۔

امام حسینؑ انسانی ضمیر کو بیدار کر رہے ہیں: اے میرے ساتھیو! اے میرے گھر والو! اے میرے وفا شعار دوستو! اس رات کو غنیمت سمجھو! اس اندھیرے اور سنّاٹے سے فائدہ اٹھاؤ! اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔ میں تمہیں اپنی اطاعت اور بیعت سے

آزاد کرتا ہوں کیونکہ میرے دشمن میری جان کے علاوہ کسی دوسرے کے طالب نہیں اور اگر وہ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ان کو کسی اور کی فکر باقی نہ رہے گی - اس لیئے میرے عزیز دوستو! تم اپنی جان کیوں کھوتے ہو اور اپنے اقرباء اور ساتھیوں کو کیوں تکلیف میں مبتلا کرتے ہو مجھے تنہا اس صحرا میں چھوڑ کر جدھر دل چاہے چلے جاؤ میں دشمن کی تلوار کا تنہا مقابلہ کروں گا اور اگر تم کو یہ خیال ہے کہ تمہیں جاتے ہوئے کوئی دیکھ لیگا اور سب کے سامنے واپس جانے پر تم کو شرم آتی ہے تو لو! یہ شمع بھی بجھائے دیتا ہوں - اب تو اندھیرا ہو گیا! ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا! کوئی کسی کو نہیں دیکھ سکتا - اپنے عزیزوں کا ہاتھ پکڑو اور یہاں سے چلے جاؤ - دنیا ایسے مواقع پر ساتھیوں کو تلاش کرتی ہے اور لشکر میں اضافہ کرتی ہے - مگر امام حسینؑ ساتھیوں کو رخصت کر رہے ہیں اور تعداد کم کر رہے ہیں - اس لیئے کہ وہ سلطنت اور حکومت کے خواہاں نہ تھے، ان کی نظر دنیا طلبی پر نہ تھی - وہ دین کے طلب گار تھے وہ حق کو باطل سے الگ کرنا چاہتے تھے اور اسی لیئے ساتھیوں کی اس کثرت کے خواہاں نہ تھے جس میں ایمان نہ ہو ایسے لاتعداد لشکر کی ان کو ہوس نہ تھی جس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو اور

جو آخرت و روز حساب پر یقین نہ رکھتا ہو - وہ چاہتے تھے کہ جو میدان شہادت میں جائے وہ دیانت و حقانیت کے سچے اور پاک جذبہ کو لیکر جائے وہ سچے اور پکے دینداروں کے طالب تھے خواہ انکی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو یہاں تک کہ وہ اسپر بھی تیار رہتے تھے کہ ان کے تمام ساتھی انھیں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں - مگر وہ ایسے ساتھی اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے جو کسی قیمت پر بھی خریدے جا سکتے ہوں۔

امامؑ کا یہ دلولہ انگیز ارشاد سن کر انصار و اقربائے نے چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا ، اور ہر ایک عرض کرنے لگا: یادگارِ رسولؐ! فرزندَ فاطمہؑ! ہمیں آخر کس روز کے لیئے اللہ نے پیدا کیا ہے سیکڑوں مرتبہ ہمیں قتل کیا جائے اور پھر زندگی ملے جب بھی ہم ہر مرتبہ حضور کے سامنے شرفِ شہادت حاصل کریں گے اور کبھی اس خدمت سے مُنہ نہیں موڑیں گے - امامؑ نے دنیا کو دکھایا کہ اُن کے ساتھی کیسے وفادار تھے کیسے مخلص تھے اور کیسے خدا ترس تھے:-

"لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفیٰ مِنْ اَصْحَابِیْ" میں نے ایسے باوفا ساتھی نہیں دیکھے جیسے میرے ساتھی ہیں - آپ کا مشہور شعر ہے :-

اَلْمَوْتُ اَوْلیٰ مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ وَالْعَارُ اَوْلیٰ مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

ننگ و عار اختیار کرنے سے موت بہتر ہے - اور جہنم کی آگ میں

جانے سے دنیا کی ذلت و اہانت برداشت کر لینا افضل ہے۔

امام حسینؑ نے ہم کو انسان کے سر کی قیمت بتائی ہے۔ انہوں نے ہم کو احساس برتری کے طریقے سکھائے ہیں۔ نوعِ بشر کو تاریخ میں ایک لازوال جگہ دی ہے۔ نظم و ضبط کے آئین سمجھائے ہیں۔ انھوں نے انسانی ضمیر سے موت اور اسیری کا خوف ہمیشہ کے لیئے دور کر دیا اور اپنے عمل سے دکھا دیا کہ دیانت اور حق کی حفاظت کے لیئے بڑے سے بڑے اقتدار سے ٹکر کیونکر لی جاتی ہے۔

سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

(چشتی رح)

فاطمہؑ کا لال

انسانی تاریخ کے ہر دور میں کچھ ایسی برگزیدہ ہستیاں آتی رہی ہیں جنہوں نے دیانت اور صداقت کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کی ہیں اور اللہ کی راہ پر اپنی کل متاعِ زندگی لٹا دی ہے۔ اگر ایسے دینی سرفروش سربکف میدانِ آزمائش و ابتلاء میں نہ نکلتے رہتے تو یہ ساری دنیا ایک کرۂ آتش بن جاتی جہاں جہالت و بہیمیت کے شعلے انسانیت اور حق پرستی کی تمام قدروں کو جلا کر ہمیشہ کیلئے فنا کر دیتے۔ اسلام چونکہ فلاحِ دنیوی اور نجاتِ اُخروی کا علمبردار ہے اور بجا طور پر انسانیت کی ہر مشکل کا حل ہے اس لیئے اس کی بقا خود انسانی اقدار کی بقا ہے اور اس کی موت اور زوال خود انسانیت کی موت اور زوال ہے اور یہ بقاء صرف اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب ان قدروں کی حفاظت کرنے والے پیدا ہوتے رہیں اور ان کی راہ میں قربانیاں پیش کرتے رہیں۔ فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی بےمثال قربانی بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اور مقصد یہی تھا کہ جس تنہا

وسیلہ پر انسان کی فلاح ونجات کا انحصار ہے اسے فنا ہونے سے بچایا جا سکے اور دنیا کی گمراہ طاقتیں اس کی جڑوں کو نہ کاٹ سکیں حق اور باطل الگ الگ نظر آنے لگیں اور باطل کی حق کے ساتھ آمیزش کرنے کی جو گہری سازش کی گئی تھی وہ ہمیشہ کے لیئے بے نقاب ہو جائے اور نسلِ انسانی کی حقیقت رس اور حق شناس نگاہیں آسانی کے ساتھ دیکھ سکیں کہ اسلام کا اصلی چہرہ کیسا ہے - دوسری بات یہ بھی بڑی اہم ہے کہ یہ قربانی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھی جس کی لوگوں کو یا خود قربانی پیش کرنے والوں کو پہلے سے خبر نہ ہو بلکہ اس سے بہت لوگ پہلے ہی سے واقف تھے۔ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بار بار پیشینگوئی فرما کر اصحابِ کبارؓ و اہل بیتؑ اطہار کو اس سے پوری طرح با خبر کر دیا تھا -
کسی قوم کے عام سیاسی اور اخلاقی حالات کا ہمیشہ ایک خاص دھارا ہوا کرتا ہے اور بڑی حد تک اس کے نتیجے بھی یقینی ہوا کرتے ہیں اور واقعات و حالات کے اس دھارے پر بھروسا کر کے بہت سی باتیں مستقبل کے متعلق کہی بھی جا سکتی ہیں لیکن بہر صورت یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ دھارا کوئی نیا رخ اختیار نہ کرے اور وہ

پیشین گوئیاں بدل نہ سکیں۔ مگر یہ سب تو عام ذہنی سطح کی باتیں ہیں لیکن جہاں تک وحی الہٰی کا تعلق ہے اس کی تو بات ہی دوسری ہے، وہاں جو کچھ بھی بتایا جاتا ہے اسکی بنیاد نہ بدلنے والے اور اور غیر متزلزل تکوینی ضابطوں پر ہوتی ہے اور علمِ خداوندی اُن ضابطوں اور اُن کے نتائج کے نہ بدلنے کی ضمانت دیتا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لیۓ بھی اسکا پابند نہیں ہوتا کہ ظاہری یا باطنی حالات کا سلسلہ قائم رہے اور حادثات و واقعات کی ترتیب اور دھارا ایک حال پر جاری اور باقی رہے یا دوسری شکلیں اور دوسرے رخ اختیار نہ کرلے۔ یقیناً واقعۂ کربلا کچھ خاص اخلاقی اور سیاسی تاریخی حالات کا اچانک اتفاقی نتیجہ ہی کہا جا سکتا تھا اگر یہاں سوال صرف حالات ہی کا ہوتا اور اس قربانی کا بار بار ذکر سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی زبانِ اقدس پر اور آپ سے پہلے ابو الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر ہر نبیؑ اور ہر وصیؑ کی زبان پر اور ہر دَور کے الٰہی صحیفوں میں نہ ہوتا۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ واقعۂ کربلا تھا تو تاریخی حالات کے سلسلہ ہی کا نتیجہ اور تکوینیات کے تقاضوں ہی کے مطابق مگر یہ محض اتفاقی اور اچانک وقوع میں نہیں آیا تھا بلکہ ازل ہی سے اس راز سے خاصانِ خدا کو باخبر کر دیا گیا تھا جو حالات کے اس دھارے سے

اور اُس کے اس عظیم نتیجہ سے پوری طرح واقف تھے۔ یہاں پر عالم کے تکوینی نظام اور اُس کے ضوابط سے متعلق صرف اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس نظام کا خالق تو یقیناً اللہ ہے مگر اُس کے ارادہ کو اس نظام کے نتیجوں میں کوئی دخل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر جیسے کوئی آگ میں گرے گا تو جل جائے گا اور زہر کھائیگا تو مرجائیگا۔ اس قسم کے انفرادی تاثرات اور نتائج کا براہِ راست تعلق تکوینی نظم و ضبط سے ہی ہے نہ کہ ارادۂ خداوندی سے ورنہ جزا اور سزا اور معاد کا کوئی تصوّر ہی باقی نہ رہے گا البتّہ ان نتائج و اعمال سے خدا کی رضامندی یا ناراضی کا ضرور تعلق ہوتا ہے مگر وہ تعلق ارادہ کی حد تک نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ عالمی حالات کے اتفاقی نتائج اللہ کے لیئے اجنبی نہیں ہوتے، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اُن کی اجنبیت اور ان کے اتفاقی حوادث ہونے کی حیثیت صرف ہمارے ناقص علم کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے۔ غرض واقعۂ کربلا اُس وقت کے بہت سے مسلمانوں کے لیئے اور خود حضرتِ امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کے لیئے اجنبی اور اچانک حیثیت نہیں رکھتا تھا اگرچہ یہ تاریخی حالات کے تسلسل ہی کا نتیجہ تھا۔ اس طرح امامؑ عالی مقام اور آپ کے وفادار ساتھیوں

کے جذبۂ تسلیم و رضا، عزم و استقلال اور صبر و ثبات کی حیثیت اسقدر بلند اور پرشکوہ ہو جاتی ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ سرورِ کائنات نے سب سے پہلے اس واقعہ کا ذکر اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ سے اس وقت کیا تھا جب امام حسینؑ کی ولادت ہوئی تھی اور بچہ کو حضورؐ کی گود میں دیا گیا تھا۔ عام طور پر ایسے موقع پر لوگ خوش ہوا کرتے ہیں مگر حضرت رسالتمآب آب دیدہ ہو گئے اور بیٹی سے ہونے والا واقعہ بیان فرما دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد آنحضرتؐ نے اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہؓ کو کچھ مٹی عطا کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ کربلا کی خاک ہے اور کربلا ہی حسینؑ کا مقتل ہے پھر حکم دیا تھا کہ زوجۂ رسولؐ اس مٹی کو حفاظت سے رکھیں یہاں تک کہ جب وہ وقت آئیگا اور حسینؑ شہید ہوں گے تو یہ مٹی خود بخود سرخ ہو جائے گی۔ اُمّ المومنینؓ نے اس خاک کو کلیجہ سے لگا کر رکھا تھا۔ آخر سنہ ۶۱ھ آ گیا امام حسینؑ کربلا پہنچ چکے تھے۔ پھر عاشورہ کا سورج کربلا کے خونین اُفق سے طالع ہوا اور بلند ہو کر ڈھلنے لگا۔ یہ قیامت کے سورج سے کم نہ تھا۔ عصر کا وقت آ گیا۔ معرکۂ کربلا اپنے آخری نقطہ پر پہنچ چکا ہے! حضرت اُمِّ سلمہؓ مدینہ ہی میں تھیں۔ عصر کے وقت آنکھ لگ گئی۔ ! خواب میں

دیکھا۔ سرورِ دو عالم تشریف لائے ہیں۔ چہرۂ مبارک پر بے انتہا آثارِ حزن و ملال ہیں! محاسنِ مبارک اور سرِ اقدس پر خاک پڑی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو برس رہے ہیں! اُمِّ سلمہؓ یہ اندوہناک منظر دیکھ کر تابِ ضبط نہ لا سکیں اور خود بھی رونے لگیں۔ پھر عرض کی! اے خدا کے آخری رسُول! آپ اسقدر کیوں رنجیدہ ہیں۔ طبعِ رسالت پر کونسی بات گراں گزر گئی؟ ۔ رسُولُ اللّٰہ نے فرمایا:

اُمِّ سلمہؓ ۔ ابھی ابھی حسینؑ کو شہید ہوتے ہوئے دیکھ آیا ہوں۔ زوجۂ رسولؐ کی آنکھ کھل گئی۔ لرزتی ہوئی اور کانپتی ہوئی اُس حُجرے کی طرف دوڑیں جہاں پیغمبرؐ کی عطا کی ہوئی مٹی ایک شیشہ میں رکھی ہوئی تھی۔ اُمُّ المومنینؓ نے اسے غور سے دیکھ کر رونا شروع کر دیا کیونکہ اب اس شیشہ میں مٹی نہ تھی بلکہ اُس سے تو خونِ تازہ اُبل رہا تھا۔

۷۸۶

کربلا سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے
قربانی کا

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ بدی کی طاقتیں ابھرتی رہیں اور انسانیت کے مشترکہ مفاد کو تباہ و برباد کرتی رہیں۔ جب ہم لوٹ مار، ظلم و جور اور ہوسنا کی کے اُن واقعات کو دیکھتے ہیں جن میں صرف ذاتی مفاد کے چہرہ پر انسانی فلاح اور جمہور کے حقوق کے تحفظ کی نقاب ڈال کر سماجی گناہوں کا ارتکاب کیا گیا تو حیرت اور غم و غصہ کے ایک گہرے سمندر میں ہم ڈوبنے لگتے ہیں اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جبر و استبداد اور ظلم و جور کے ان ہولناک طوفانوں میں انسانی زندگی کیونکر اب تک باقی رہ سکی اور کس طرح یہ دنیا اس وقت تک اس قابل رہ گئی کہ اس میں رہنا اور جینا ممکن ہے۔ ساتھ ہی ہماری یہ حیرت اور پریشانی اُس وقت بالکل ختم ہو جاتی ہے جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایسے تمام موقعوں پر کچھ عظیم تاریخی شخصیتیں سامنے آتی ہیں اور ان میں غیر معمولی دور اندیشی اور قوتِ عزم و عمل موجود

ہوتی ہے اور وہ برائی اور گمراہی کے تباہ کن طوفانوں اور ظلم واستبداد کے دھارے کا رخ موڑ دیا کرتی ہیں - اور سسکتی ہوئی انسانیت میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہیں -

ان تمام عظیم شخصیتوں میں جنھوں نے اجتماعی مفاد کی بہتری اور انسانیت کی فلاح کے لیئے کام کیا اور بدی کی پُرشکوہ طاقتوں کا مقابلہ کیا اور پھر اپنے مقصد میں فتح حاصل کی یہ امر مشترک ہے کہ ان میں کی ہر شخصیت نے اپنے ذاتی مفاد اور ذاتی عیش و آرام کو جمہور کی بہبود اور نوع انسان کے بنیادی مقاصد اور اس کی رہنمائی اور فلاح کے لیئے قربان کر دیا تھا - اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے انھوں نے جان و مال اور ہر اس ذاتی منفاد کی قربانی پیش کی جس کا پیش کرنا اُن کے لیئے ممکن تھا وہ خوف اور طمع کے مقابلہ میں سنگلاخ چٹانوں کی طرح کھڑے رہے انھوں نے اپنے عزم محکم اور سچائی کی بے پناہ طاقت سے اور غیبی رہنمائی کے سہارے سے کمزور انسانوں کی مدد کی اور آزادی ضمیر کا وہ حق جو ان سے زبردستی چھین لیا گیا تھا انھیں واپس دلوایا اور گمراہ نفوس کی ہر ممکن صورت سے ہدایت و رہنمائی کی اور یہ سب اس وجہ سے کہ خدا نے یہ نہیں چاہا کہ یہ دنیا ایک بدترین جگہ بن جائے

یا یہ کہ نسل انسانی عیش پرست اور وحشی درندوں کی نسل بن کر رہ جائے۔ یہ عظیم شخصیتیں اس حقیقت پر یقین رکھتی تھیں کہ اس دنیا میں انسان صرف عیش و عشرت اور کھانے پینے کے لیے نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ اعلیٰ مقاصد اور بیش قیمت نظریات کی خدمت کرنا اور ان کے لیے ہر ممکن قربانی پیش کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے اگر ایسے عزم و ارادہ کے پکّے اور سچّے انسان نہ پیدا ہوتے تو یقیناً آج بھی انسانی زندگی وحشی اور جنگلی قوانین کی زنجیروں میں ایک کمزور قیدی کی حیثیت میں ہوتی اور انسان آزادیٔ ضمیر اور اپنے انفرادی اور اجتماعی جائز حقوق کی طلب کا تصور بھی نہ کر سکتا اور پوری دنیا ایک ایسا جہنم بن کر رہ جاتی جہاں سماجی اور اخلاقی اصول بہیمیت کی آگ کے شعلوں میں جلتے رہتے۔

اعلیٰ مقاصد اور انسانی فلاح کے مقدّس کام کے لئے جن تاریخی شخصیتوں نے قربانیاں پیش کر کے انسان کو نجات دی ان میں حضرت سیّد الشہداء امام حسین علیہ السلام کی ذات ایسی منزل پر ہے جہاں قربانی اور ایثار، خدمت اور جذبۂ دیانت کی وہ مثال قائم ہوئی جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ کے اوراق قاصر ہیں کسی تاریخی شخصیت کی عظمت کو سمجھنے کے لئے ہمیں

اس بات کو بھی سمجھنا پڑے گا کہ اس مقصد کی حیثیت کیا تھی جس کے لیئے اس نے قربانیاں پیش کیں اور جان و مال و اولاد کی بازی لگائی اور ساتھ ہی یہ کہ اسکے اس کردار کے اخلاقی رخ کیا تھے - ان باتوں کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد ہماری نگاہوں میں اس شخصیّت کی صحیح عظمت سما سکتی ہے اور ہم اس کے اصلی مقام کو جان سکتے ہیں ورنہ نہیں - اس بنا پر اگر ہم امام حسین علیہ السلام کی اس قربانی کے اخلاقی پہلو اور صحیح مقاصد کو نہ سمجھیں تو پھر اس قربانی کی وقعت ہمارے سامنے دو بادشاہوں اور دو لشکروں کی جنگ سے زیادہ نہیں ہو سکتی - اس لیئے ہمیں پوری دیانت اور سچائی سے اس حقیقت پر غور کرنا ہو گا کہ امامؑ عالی مقام کی اس قربانی کا صحیح مقصد کیا تھا اور اس کے اخلاقی اور اسلامی پہلو کیا تھے - آپ نے صرف اپنی ہی جان و مال کی قربانی نہیں پیش فرمائی بلکہ اپنی اولاد، اپنے چاہنے والوں، اپنے ساتھیوں یہاں تک کہ چھ ماہ کے فرزند حضرت علیؑ اصغر کو بھی کربلا کے میدان میں اعلائے کلمۂ حق اور بقائے اسلام کی راہ میں قربان کر دیا اس جرأت و ہمت کے ساتھ جو پہلے کی طرح آج اور اب بھی اپنی آپ ہی مثال ہے - اتنی اہم قربانی اور ایسی عظیم خدمت کس مقصد کے لیئے ہو سکتی ہے

جبکہ آپکے لیئے بہت ہی آسان بات تھی کہ آپ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور ہر طرح کے دنیاوی عیش و آرام کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر آپ نے اپنے وطن کو چھوڑا خاندان سے جدا ہوئے قبر رسولؐ کے فراق کو گوارا کیا اور ہر قسم کا ذہنی اور جسمانی سکون و راحت چھوڑ کر خون کی بارش اور موت کی گرج کے سامنے عورتوں بچوں، ساتھیوں، عزیزوں اور ایک بہت ہی مختصر جماعت کے ساتھ آ گئے یہ اعلیٰ مقصد اور عظیم غرض صرف یہی تھی کہ اُس وقت آپ اسکو اپنا فرض سمجھ رہے تھے کہ دیانت و اسلام اور سچائی کی صحیح خدمت صرف یہی ہے کہ آپ کربلا کی قربان گاہ پر اپنی ساری انمول قربانیاں پیش فرما دیں اور تحفظِ اسلام کے لیئے اُس ناپاک اور بے دین حکمران سے ایک فیصلہ کن اور آخری جنگ کریں وہ حکمراں جو نہ صرف خلیفہ "المسلمین بن جانے کی دھمکی دے رہا تھا بلکہ مسلمانوں کی رہبری کا دعویدار بھی تھا اور دیانت کے چہرہ پر اپنے ناپاک سماجی اور سیاسی اصول کی نقاب ڈال کر اسلام اور اس کی روحانیت کو ہمیشہ کے لیئے زمین میں دفن کر دینا چاہتا تھا" اسلام و دیانت کے لیئے جنگ" کا مطلب صرف یہ تھا کہ امام حسینؑ نے انسانیت کی بھلائی اور اُس کی صحیح رہنمائی کے لیئے جنگ کی تھی اصلاً اسکی

اعلیٰ مقصد کے لیئے قربانیاں پیش فرمائیں یہ کوئی محدود اور جماعتی مقصد نہ تھا جس کا کسی خاص خاندان یا خاص خِطۂ زمین سے تعلق تھا بلکہ یہ اصول کی جنگ تھی، حق و باطل کی لڑائی تھی دیانت اور بے دینی کی جنگ تھی - ایسی لڑائیاں جب بھی لڑی گئیں تو اُن میں فتح و شکست کا معیار وہ نہ تھا جس کو عوام فتح شکست سمجھتے ہیں - ان لڑائیوں میں نتائج اور مقصد کی بلندی اور سچائی کے لحاظ سے فتح و شکست کے اصول بنائے جاتے ہیں اور پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس مقصد کے لیئے دو فریق نبرد آزما ہوئے تھے اس کے حصول میں کونسا فریق کامیاب رہا - یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ظالمانہ طاقتوں کی بھوک اتنی شدید ہوا کرتی ہے کہ وہ ساری برائیوں کو نگل جاتی ہے - یزید بھی ظلم و استبداد کی مکمّل نمائندگی کر رہا تھا اسے مادّی اقدار کے حصول میں ابتدائی کامیابیاں حاصل ہو چکی تھیں اُس نے سیاسی اقتدار کو غصب کر لیا تھا، اور رشوت، ناجائز دباؤ اور ظلم و مکّاری سے اس نے لوگوں سے بیعت لے لی تھی سوائے چند افراد کے جو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تھے - ظلم و اقتدار کی نہ ختم ہونے والی بھوک ہی تو تھی جس کی وجہ سے اُس نے اب نواسۂ

رسولؐ کے سامنے بھی بیعت کا مسئلہ پیش کیا جس کا مطلب صاف تھا کہ آپ اُس کی سرداری اور اقتدار کو دینوی اور دینی حیثیتوں سے تسلیم کرلیں۔ جس کا نتیجہ صرف یہ تھا کہ امامِ حسینؑ اُن تمام اخلاقی اور اسلامی قدروں اور سارے دینی تصورات اور حقیقتوں کو ترک کردیں جن کے وہ امانتدار تھے اور جو انہیں اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھیں اور اس کا دوسرا رخ بھی بالکل صاف تھا کہ اگر یہ بات ممکن نہ ہو سکے تو پھر آپ ہر اُس مصیبت اور آفت کو برداشت کریں جو ممکن ہو سکتی ہے۔ امامؑ عالی مقام اپنے فرض کو پوری طرح پہچانتے تھے، وہ اسلام کے اصول اور اس کی سچائی کے امین تھے، وہ اُس دور میں تحفظِ ناموسِ اسلام کے لیے نواسۂ رسولؐ اور امام ہونے کی حیثیت سے سب سے زیادہ ذمہ دار تھے اس لئے انھوں نے اس بیعت کی طلب کو حقارت کے ساتھ ٹھکرادیا۔ ضمیر کی آواز اور احساسِ فرض کی شدّت اُن کے عزمِ محکم کی بنیاد تھی اور ان تمام خوفناک نتائج کے مقابلہ میں بہت زیادہ قوی تھی جو شکست کے بعد دشمن درندوں کے ہاتھوں میدان کارزار میں برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ آپ نے نسلِ انسانی کو اپنی اس عظیم قربانی سے یہ بات پوری طرح سمجھا دی ہے کہ اپنا ذاتی مفاد، اور

عزیزوں اور دوستوں یا اپنی اولاد اور رشتہ داروں کے مفاد اور اُن کا آرام و راحت، ان میں سے کوئی چیز بھی سچے اصول اور پاک نظریات کے بچاؤ کے مقصد کے سامنے کسی قسم کی بھی وقعت نہیں رکھتی۔ کیا تشدد اور ظلم کے ہاتھوں میں زنجیریں ڈالنے کے لیئے امام حسینؑ کی قربانی سے زیادہ اہم کوئی مثال ممکن ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب بالکل صاف ہے کہ ہرگز نہیں۔ اس قربانی نے بتا دیا کہ بدی کا مقابلہ ہر قیمت پر کس طرح کیا جا سکتا ہے اور چند افراد ٹڈی دل لشکروں کے مقابلہ میں کس طرح دیانت اور حق کی حمایت کا فرض ادا کر سکتے ہیں۔

شہادت کی عظمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔ (البقرۃ/١٥٥ - ١٥٧)

قرآن کریم میں اللہ کا ارشاد ہے: اور ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مال اور جان اور پھلوں کے نقصان سے اور ایسے صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیدو جن پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ بےشک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بےشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں کہ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی جانب سے عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں ۔ ان آیات میں صابرین کی مدح و ثناء کی گئی ہے ۔ درحقیقت صبر کی اصلی تعریف یہ ہے: "حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰی مَا يَقْتَضِيهِ الْعَقْلُ وَالشَّرْعُ"

یعنی اپنے آپ کو اُن باتوں میں محدود رکھنا اور اُن چیزوں کا پابند رہنا جن کا عقل و شرع حکم دیتی ہو۔ یہ ایک ایسی جامع اور وسیع تعریفِ صبر ہے جس کے اندر مردِ مؤمن کی زندگی کا ہر پہلو آجاتا ہے۔ اور اسی لیے مخوف، بھوک، جان و مال اور ثمرات یعنی پھلوں کا ذکر فرماکر گویا ہر اس چیز کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جس کا انسان کی زندگی سے تعلق ہوسکتا ہے اور اس طرح ضمناً یہ بتا دیا گیا کہ انسان کا اصلی مَقام تو مصیبتوں ہی میں آشکار ہوتا ہے۔ پھولوں کی سیج پہ کروٹیں بدلنے سے اس کا حقیقی مرتبہ ظاہر نہیں ہوتا جبتک کانٹوں سے بھی اس کو سابقہ نہ پڑے ساحل کی دلفریبیوں میں مست رہنے والے جبتک ظالم موجوں اور بے رحم طوفانوں سے ٹکّر نہ لیں اُن کا جوہر نہیں کھلتا، سونے کے کھرے کھوٹے ہونے کا پتہ تو اُسی وقت چلتا ہے جب اسے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا جائے۔ غرض صبر وہ جلیل صفت ہے جو انسانی کردار کی تشکیل کرتی ہے اور اسلامی ذہن وضمیر کی تخلیق و تعمیر کرتی ہے اور عبدیّت و اخلاص کی بلند ترین صفتوں کے لئے محوَر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی صبر نے انسان کو کائنات کی سرداری دی ہے اور اسی صفت نے بشری مخلوق

کو امامت و نبوت کے عظیم منصب کا اہل اور مستحق بنایا ہے۔
اسی صبر کی بلند ترین مثال تھی جو معرکۂ کربلا میں حضرت سید الشہدا
امام حسین علیہ السلام نے پیش فرمائی اور اس سخت اور
شدید آزمائش میں کامیاب ہو کر آپ نے عالم انسانیت
کے لیے عزم و ثبات اور صبر و استقلال کا ایک ایسا اعلیٰ
نمونہ پیش کر دیا جو اسوۂ محمدیؐ اور سیرت سرورِ کائنات کی
پوری اور سچی تصویر تھا آپ نے اپنے صبر و استقلال سے اس
حقیقت کو ثابت کر دیا کہ حق کبھی باطل کی اطاعت نہیں کر سکتا
اور ایمان کبھی کفر و الحاد اور دنیا پرستی کے آگے سر تسلیم نہیں
جھکا سکتا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مصیبتوں اور آفتوں کے
بڑے سے بڑے طوفان بھی مرد مؤمن کے قدم کو اللہ کے راستہ
سے ہٹا دینے پر قدرت نہیں رکھتے۔ خطۂ کربلا پر جو عظیم امتحان
دیا گیا، جو عظیم قربانی پیش کی گئی اور جس شہادتِ عظمیٰ کو
دنیا نے کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ تسلیم و صبر و رضا کی
ایک لازوال مثال ہے جو قیامت تک انسانیت کی رہبری کرے گی
امام حسینؑ اور آپکے سرفروش ساتھی اور جانباز اصحاب بھوکے اور
پیاسے راہ حق میں شہید ہو گئے ان کا کنبہ اسیر ہوا اور ان پر طرح

کی مصیبت کے پہاڑ گرائے گئے مگر وہ باطل کے آگے نہ جھکے اور انھوں نے اپنے عظیم کردار سے پوری دنیا کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکّہ جما دیا۔ یہ ہیں وہ زندۂ جاوید شہید جنکی قرآن کریم میں اللہ مدح و ثنا فرماتا ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (سورۂ آل عمران) آیہ ۱۶۹ - ۱۷۱)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں انھیں ہرگز مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں رزق پاتے رہتے ہیں وہ اُن نعمتوں پر خوش ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے انھیں عطا فرمائی ہیں اور جو لوگ ابھی تک اُن کے پاس نہیں پہنچے ان کے پیچھے رہ گئے ہیں وہ اُن کی بھی اس حالت سے خوش ہیں کہ اُن پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع و برباد نہیں کرتا۔ درحقیقت یہی تو وہ لوگ ہیں جن کو اسلام "شہید راہِ خدا" کہتا ہے اور جنکی ابدی حیات پر پورے عالمِ اسلام کا

اجماع و اتفاق ہے۔ یہ وہ پاک لوگ ہیں جو غیر اسلامی اور خالص دنیوی مقاصد کے لیئے نہیں بلکہ خالص الٰہی اور دینی مقاصد کے لیئے قربانیاں پیش کرتے ہیں اور شہیدِ راہ خدا تو وہی ہے جو اللہ اور صرف اللہ کے لیئے اپنی جان کو نثار کر دے اور اس کی اس قربانی اور اس موت میں کوئی ایسی غرض شامل نہ ہو جو دینی اور اسلامی روح کے منافی ہو تاکہ اُسے مقتول فی سبیل اللہ" اور "شہیدِ راہ خدا" کہا جا سکے اور یہ کہنا درست اور صحیح ہو سکے۔ قرآن حکیم نے ایسے مرنے والوں اور ایسے صبر کرنے والوں کے لیئے قیامت سے پہلے عالمِ برزخ ہی میں حیاتِ ابدی کا اعلان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حیاتِ ابدی اور یہ نعمتیں انھیں اسی لیئے ملا کرتی ہیں کہ انھوں نے صبر کیا استقلال سے کام لیا اور خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دیا اور اپنی جانیں تک نذر کر دیں دنیا نے اُن کو اپنی طرف مائل کرنے کی ہر طرح سے بھرپور کوشش کی مگر خوف اور لالچ کے ہر سیلاب میں وہ پہاڑوں اور چٹانوں کی طرح اپنی جگہ پر جمے رہے اور آگ اور خون کے طوفانوں میں بھی راہِ حق سے نہ ہٹے۔ اگر ایسے سچّے اور پکے اہل ایمان یقین ہر دور میں نہ آتے رہتے تو آج پوری دنیا ایک ایسا جہنم بن جاتی جس میں انسانیت کی تمام قدریں بہیمیت کی آگ میں جلکر ہمیشہ کیلئے

ناپید اور فنا ہو جاتی - بلاشبہ صبر کرنے والوں میں اور انسانی اور دینی اعلیٰ قدروں کی حفاظت و حمایت میں جن مثالی انسانوں نے اب تک دنیا میں جان و مال کی قربانیاں پیش کی ہیں ان میں نواسۂ رسولؐ کو ابدی عظمت اور بلند ترین مقام حاصل ہے - فرزند فاطمہؑ کی اس شہادتِ عظمیٰ نے دنیا کو پوری طرح بتا دیا کہ اپنا ذاتی مفاد ہو یا اولاد اور دوستوں اور ساتھیوں کا مفاد ہو حق کی حفاظت اور دین کی بقا کی اہمیت کے سامنے اس کی کوئی بھی وقعت اور قیمت نہیں ہوتی - اس شہادتِ عظمیٰ نے مسلمان کو سکھایا ہے کہ بدی اور فسق و فجور کے خلاف کس طرح جہاد کیا جاتا ہے اور کسطرح قربانیاں دی جاتی ہیں اور گنتی کے چند نہتّے، بھوکے اور پیاسے مردانِ حق کس طرح باطل کے لشکرِ کثیر کا مقابلہ کر کے ناموسِ حق کی حفاظت و حمایت کا فرض ادا کرتے ہیں - شہید بارگاہِ خداوندی کا مقرّب ترین بندہ ہے، شہید سرمایۂ تاریخِ حق و دیانت ہے، شہید کی حیات لازوال ہے اور فرزند محبوبِ کبریا، سرورِ انبیاء امام حسینؑ شہیدوں کے سردار ہیں -

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خاندانی نظام کی اہمیت

اسلام نے جہاں انسانی معاشرہ کے اجتماعی نظام کو اس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا کہ اس کا کوئی ایسا گوشہ اور شعبہ باقی نہ رہ سکا جس میں اس کی فلاح و بہبود کا بھرپور تصور نہ پایا جاتا ہو، ساتھ ہی اس نے حقوق و اخلاق اور احساس فرض کے اعلیٰ اصول اور مستحکم ترین بنیادوں پہ معاشرہ کی چھوٹی اور جزئی تقسیموں کی بھی بہترین طریقہ سے تنظیم کی اور اس کے لیئے ہمیں انتہائی معتدل اور منصفانہ ضابطے اور قانون تعلیم کیئے۔

یوں تو ہر فرد ہی کی زندگی اور کارکردگی معاشرہ کی اجتماعی خوشحالی یا بدحالی اور ترقی یا تنزل سے گہرا لگاؤ رکھتی ہے اور اس کیلیئے وہ اپنی حد تک بڑا مؤثر کردار ادا کرتی رہتی ہے لیکن جب فرد کی وحدت وسیع تر ہو کر معاشرہ کی نسبتہً بڑی تقسیموں کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کے دائرۂ عمل

اور کارکردگی میں بھی لازمی طور پر اضافہ ہونا ضروری ہو جاتا ہے اور اس کا عمل بھی مؤثر ترین بن جاتا ہے۔

انسانی حیاتِ اجتماعی کی چھوٹی وحدتوں اور جزئی تقسیموں میں واضح طور پر خاندانی نظام کو بڑی اہمیت اور بہت اونچا مقام حاصل ہے کیونکہ اصولی حیثیت سے وہ بہ نسبت فرد کے معاشرہ کے عام اجتماعی نظام سے نزدیک تر ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ اسلام کے نزدیک فرد کی عزّت اور مرتبہ صرف اس کے شخصی کردار اور عملی امتیاز ہی پر منحصر ہے لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ بہر حال اپنی اجتماعی زندگی میں پیدائشی طور پر انسانوں کے ایک جتھے کا رکن بھی ہوتا ہے جسے اس کا کنبہ، گھرانا اور خاندان کہتے ہیں اور اس طرح معاشرے کی اس اہم ترین چھوٹی وحدت کی طرف سے اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہو جاتی ہیں جنکو انجام دینا اس کی اجتماعی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اسی سلسلہ میں ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کیا حقوق و فرائض ہیں جو فرد اور خاندان سے متعلق ہمیں تعلیم دیئے گئے ہیں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ پیدائش

کے بعد انسان کا پہلا تعلق جن لوگوں سے ہوتا ہے وہ اس کے ماں باپ ہیں - وہی اس کی پیدائش کا وسیلہ اور تربیت حفاظت کا ذریعہ ہوتے ہیں اگر وہ نہ ہوں تو نہ اس کا وجود ہی ہوتا ہے اور نہ اس کی زندگی، تربیت اور نگہداشت کے وہ طریقے ممکن ہیں جو والدین کی وجہ سے بہ آسانی ممکن ہو سکتے ہیں - اسی بنا پر اسلام نے بھی والدین کو بڑی اہمیت دی ہے اور ان دونوں میں بھی ماں کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ باپ کو نہیں ہے کیونکہ ماں کا عمل اور اس کی خدمت اولاد کے حق میں بڑی جفاکشی، برداشت اور مسلسل محنت پر مشتمل ہوا کرتی ہے - حمل کے زمانہ اور اس کے بعد کے انتہائی روح فرسا مرحلوں سے اسی کو گزرنا پڑتا ہے اور اسی کی گود بچہ کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہوا کرتی ہے - وہی زندگی کی ابتدائی منزل میں اس کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے جبکہ باپ کی خدمت اس کے مقابلہ میں اور نسبتہً محدود اور بہرحال کم ہے - لیکن دوسروں کے مقابلہ میں باپ کو ہر صورت میں ترجیح حاصل ہے اور اسی وجہ سے اسلام نے بھی مجموعی طور پر ان دونوں ہی کو خاندانی نظام میں سب سے اونچا مرتبہ دیا ہے - سورۂ احقاف میں اللہ کا

ارشاد ہے (آیہ/۱۵) ترجمہ یہ ہے: "ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اس کی ماں نے اسے دکھ جھیل کر اپنے شکم میں رکھا اور تکلیف ہی کے ساتھ اسے جنم دیا ہے" حد ہے والدین کے احترام کی ۔! کہ اللہ نے اسے اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ نسآء/۳۶ میں اس مفہوم کی آیت موجود ہے "اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرو" ۔ قرآنِ حکیم میں بہ کثرت اسی قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت میں خاندانی نظام کی اس پہلی اور اہم ترین کڑی کو کس قدر بلند درجہ حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی یہ بیان کیا گیا تھا کہ باپ کے مقابلہ میں ماں کے جائز حقوق کو اوّلیت حاصل ہے ۔ اس کے ثبوت میں بے جا نہ ہو گا، اگر میں اپنے ناظرین کی توجہ ایک حدیث کی طرف مبذول کروں جس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک شخص کے اس سوال کے جواب میں کہ یا رسول اللہ میرے اچھے برتاؤ اور حُسنِ سلوک کا کون شخص سب سے زیادہ مستحق ہے یہ فرمایا تھا کہ تمہاری ماں! اس نے پھر عرض کی کون؟

آپ نے فرمایا : تمہاری ماں - اس نے تیسری مرتبہ پھر یہی پوچھا - پھر یہی جواب ملا - اس نے جسارت کر کے چوتھی مرتبہ پھر دریافت کیا تو آپ نے فرمایا - تمہارا باپ - اس طرح تین مرتبہ ماں کا نام اور صرف ایک مرتبہ باپ کا نام لیا - اس سے معلوم ہو جاتا ہے ، کہ خاندانی نظام میں ماں اور اس کے بعد پھر باپ کی منزل کیا ہے - ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے چار بڑے گناہوں کا ذکر فرمایا ہے اور اُن میں سب سے پیشتر ماں ہی کی نافرمانی کے گناہ کا ذکر ہے - غرض قرآنِ پاک میں جابجا والدین کے حقوق کا ذکر موجود ہے اور اسی لیئے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جب کسی کو کوئی مالی فائدہ پہنچے تو وہ ہر ممکن صورت میں ماں باپ کا سب سے پہلے خیال رکھے ، سورہٗ بقرہ (پ ۲۱) میں اسی بات کی طرف ان لفظوں میں اشارہ پایا جاتا ہے : قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ " جو کچھ تم اپنی نیک کمائی سے خرچ کرو ، وہ تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کا حق ہے - اس فرمان کے بعد پھر یتیموں ، محتاجوں اور پردیسیوں کا ذکر ہے - غرض ہر صورت میں ماں باپ اور ان کے بعد دوسرے رشتہ داروں کی مدد اور خدمت دوسرے لوگوں پر مقدّم کر دی ہے عام اس سے کہ وہ مدد اور خدمت اقتصادی نوعیت کی ہو یا کسی

اور نوعیت کی۔ رشتہ داروں میں بھی واقعی استحقاق کے ساتھ نسبی قرب کو ہر صورت میں ترجیح حاصل ہوگی۔

ماں کی خصوصی تعظیم کے حکم سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عورت کا کیا درجہ ہے جسے دنیا کی اور قوموں نے ہمیشہ اس کے جائز حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے اس کی عزّت و احترام سے نوعِ بشر کو روشناس ہونے کا موقع دیا۔ اس طرح کہ کبھی ماں کی منزل بتائی کبھی بہن کا مرتبہ سمجھایا اور کبھی بیٹی کا رتبہ تعلیم دیا اور کبھی زوجہ کے حقوق کی تشریح کی ان لفظوں میں: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (سورۂ بقرہ ۲۲۸) یعنی عورتوں کا حق دستورِ شریعت کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا کہ خود مردوں کا حق عورتوں پر ہے۔ صرف اس صورت پر کہ مردوں کو عورتوں کے مقابلہ میں ایک حد تک کچھ فوقیت ضرور حاصل ہے"۔ گھر والوں اور خاندان والوں کے حقوق سے متعلق حدیث میں ایک بڑا جامع جملہ ارشاد ہوا ہے حضور فرماتے ہیں۔ " خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ " تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے سب سے بہتر ثابت ہو

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو"۔ ساتھ ہی عورتوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے مردوں کی تعظیم اور ان کے حقوق کا پورا خیال رکھیں جن کی تعظیم و احترام اور حقوق کا خیال ضروری ہے۔ ایسے افراد میں جن لوگوں کا خاندان سے تعلق ہوتا ہے ان میں جیسے باپ، بھائی اور دوسرے رشتہ دار خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا سببی اور ازدواجی رشتہ داری رکھتے ہوں۔ سورۂ نساء میں تمام رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحم اور حسن سلوک کرنے کے لیئے بڑی جامعیت کے ساتھ اس طرح فرمایا گیا ہے (آیہ ۱)

ترجمہ یہ ہے: جس اللہ کا تم واسطہ دے کر ایک دوسرے سے درخواست اور سوال کرتے ہو خود اس کا اور اپنے تمام رشتہ داروں کا خیال رکھو" ظاہر ہے کہ اس فرمانِ خداوندی کی وسعت میں ہر طرح کا پاس و لحاظ شامل ہے خواہ وہ اخلاقی ہو، اقتصادی ہو، تعلیمی ہو، تربیتی ہو یا کسی اور طرح کا ہو، جہاں تک ماں باپ کے حقوق کا تعلق ہے اور قوموں نے بھی انھیں کچھ حق دیئے ہیں اگرچہ وہ اسلام کے دیئے ہوئے حقوق کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں لیکن خود ماں باپ پر اولاد کے حقوق کو

صرف ایک اسلام ہی ہے جس نے ہمیں بتایا ہے۔ کہیں ان لفظوں میں کہ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لیئے تحفہ ہیں اور کہیں دوسرے طریقوں سے۔ اس سلسلہ میں جہاں قرآن پاک میں یہ فرمایا گیا ہے (آیہ/۱۵۱ انعام) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ "اپنی اولاد کو قتل نہ کرو" یا سورۂ تحریم کے ان لفظوں میں جن کا ترجمہ یہ ہے: (آیہ/۶)

"اے ایمان والو! تم خود اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ"

یہاں قتلِ اولاد اور انھیں آگ سے بچانے کے فرمان میں ہر طرح کا بچاؤ شامل ہے۔ خواہ وہ اخلاقی ہو، اعتقادی یا عملی اور مادّی ہو۔ مختصر یہ ہے کہ اسلام نے ہر شخص کو اس کے خاندان اور گھرانے کی اہمیّت اس طرح سمجھائی ہے کہ اس سے بہتر نہ تو کوئی طریقہ ممکن ہے اور نہ کوئی نظام۔ یہاں اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ خاندانی اہمیّت کسی حال میں بھی کُنبہ پروری نہیں ہو سکتی بلکہ یہ پہلا زینہ ہے اور پہلی منزل معاشرہ اور قوم کی خدمت اور تعظیم کے لیئے اس لیئے کہ جو شخص اپنی ذات کے مفاد کو اپنے چند قریبی رشتہ داروں کے

لیئے قربان نہیں کر سکتا وہ قوم کے لیئے اپنے مفاد کی قربانی
کس طرح دے سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس
خاندانی نظام کی اہمیّت کا اسلام نے سبق دیا ہے وہ درحقیقت
ایک عظیم باب اور مؤثر ترین وسیلہ ہے قومی مفاد اور پورے
معاشرہ کی فلاح وبہبود کی تعلیم کا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران) آیہ/ ۱۱۰

تم لوگ بہترین اُمّت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لیۓ پیدا کی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے لوگوں کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

مسلمانوں کی زندگی کا سب سے بڑا اور بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی اصلاح اور برائیوں سے اس کی تطہیر کے ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح اور ہدایت کا کام بھی انجام دیں۔ یعنی وہ ایک ایسی شمع اور ایسا چراغ بن جائیں جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن و منور کر دیتا ہے: "مَعْرُوف" نیکی کو کہتے ہیں اور "مُنکَر" برائی کو۔ قرآنِ حکیم میں جا بجا اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی

گئی ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرتے ہیں اور برائی سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ یہ چیز اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب انسان نیکی اور بدی کی حدیں اور ان کا صحیح مفہوم پوری طرح سمجھتا ہو۔ اور اس آیت میں بھی "وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ" کا جملہ اسی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اگرچہ اَمر بالمعروف اور نَہی عن المُنکَر ایک انتہائی ضروری کام ہے مگر اس کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو خود بھی ایمان رکھتے ہوں اور حکم خدا پر عمل کرنے والے ہوں۔ ٹیپ ریکارڈر سے سن کر اور کتابوں کا لکھا ہوا پڑھ کر بھی آدمی سمجھتا ہے اور اس سے اثر بھی لیتا ہے مگر جب تک سچائی اور نیکی کی تعلیم و تبلیغ کرنے والے کی خود اپنی زندگی کی سچائی بھی پیش نظر نہ ہو اس وقت تک کلام میں پوری تاثیر اور دل و دماغ پر پورا تاثر نہیں پیدا ہوتا، اس بنا پر یہ بات ضروری ہے کہ ہدایت کرنے والا خود بھی نیکیوں سے متصف اور برائیوں سے محفوظ ہو، چور اگر دوسروں کو چوری سے منع کرے اور خود چوری کے ارتکاب میں مبتلا رہے تو اس کی بات کا کیا اثر ہوگا۔ غرض امّتِ مسلمہ کے لیئے یہ بات لازمی ہے کہ پہلے وہ خود نیکیوں کو حاصل کرے، اور

برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے اور پھر دوسروں کی بھی اصلاح ہدایت کا کام کرے۔ مقصود یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم ایمان واسلام کے علم بردار ہو، الٰہی ہدایت پر عمل اور دوسروں سے اس پر عمل کرانا تمہارا سب سے بڑا فرض ہے۔

تمہارے قول اور تمہارے عمل میں پوری یکا نگت ہونا ضروری ہے جس نیک بات کا لوگوں کو حکم دو اس پر خود بھی عمل کرو اور جس بُرائی سے دوسروں کو روکو اس کے قریب خود بھی نہ جاؤ۔ تم توحید اور پیغام خداوندی کے امانت دار ہو، تمہارا منصب یہ ہے کہ تم الٰہی قانون کی حفاظت کرو، اسلامی نظام عدل وانصاف کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرو، باطل کو مٹادو اور حق کو پوری طرح ابھارنے کی سعی کرو۔ لیکن نیکیوں کے پھیلانے اور برائیوں سے روکنے کے اس حکم کی تعمیل میں جس بات کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے وہ اس کے موقع اور محل کی صحیح مناسبت ہے۔ اسی کی طرف سورۂ نحل کی اس آیت میں اشارہ ہے: (آیہ/۱۲۵)

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔"

اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف عملی دلیلوں اور اچھی نصیحت کے ساتھ لوگوں کو دعوت دو اور ان کے ساتھ بحث کرو مگر انتہائی شائستہ طریقہ پر"۔ اس طرح بنیادی طور پہ مسلمانوں کو اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم تو ضرور دیا گیا ہے مگر اس کی شرط یہ ہے کہ تبلیغ کرنے والے خود بھی ان باتوں پر عمل کریں اور دوسروں کو ہدایت ایسے طریقہ سے کریں جو انتہائی پسندیدہ اور انتہائی مناسب اور درست ہو۔

تسخیر کائنات

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" (حضرت امیرؑ سے بھی یہ منقول ہے) جس شخص نے اپنی ذات کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے پروردگار کی بھی معرفت حاصل کرلی۔ امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام بھی اکثر یہی فرمایا کرتے تھے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ جو شخص بھی اپنے نفس سے غافل ہے اور خود اپنی ہی ذات کی معرفت نہیں رکھتا وہ اپنے حقیقی خالق اور اپنے حقیقی ربّ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ یہی ایک راز ہے جس کے نتیجہ میں غافل انسان احساس کمتری میں مبتلا ہوکر اپنی صلاحیتوں، طاقتوں اور بلندیوں کو بھول جاتا ہے اور اپنے سے کمتر مخلوق کو اپنا آقا اور اپنا مالک سمجھ کر اُس کے سامنے جھکنے لگتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کائنات کے اصلی پروردگار کے سامنے خم ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہے دوسروں کے سامنے جھکا دیتا ہے۔

ہے جو درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے خود اس کی اپنی ذات سے بھی بہت پست اور کمتر ہوا کرتے ہیں۔ بتوں کی پرستش ستاروں کی پوجا، حشراتُ الارض یعنی کیڑے مکوڑوں کی تعظیم و تکریم، درختوں، دریاؤں، پہاڑوں اور ہر ایسی جسمانی طور پر بڑی اور ہولناک چیز کی عبادت کرنے لگتا۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اسی غفلت کا اور جہالت کا کہ انسان خود اپنی ذات کو نہیں پہچانتا اور یہ نہیں سمجھتا کہ وہ خود ہی پوری کائنات کا سردار بنایا گیا ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان خود اسی کی خدمت کے لیئے بنائی گئی ہے اور وہ ہر چیز سے فائدہ اٹھانے پر پورا اقتدار رکھتا ہے۔ اسی خود شناسی کے راز کی طرف اس انتہائی معنی خیز حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے اور اسی بات کی طرف قرآن حکیم اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں چودہ سو سال سے انسانی فکر کو دعوت دے رہا ہے۔ کبھی ان لفظوں میں:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (سورۂ اعراف)

بے شک ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار دیا اور تمہارے لیئے سب اسباب زندگی مہیا کیئے ہیں اور کبھی اس لہجہ میں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ

وَ فَضَّلْنَاھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (سورۃ الاسراء) یقیناً ہم نے اولاد آدم کو عزت عطا کی ہے اور انھیں بحر و بر میں حمل و نقل کے وسائل دیئے ہیں اور انھیں پاک و پاکیزہ رزق دیا ہے اور اپنی کثیر مخلوق پر انھیں پوری برتری بخشی ہے پھر اس سے بھی بڑھ کر سورۂ لقمان میں یہ بھی کہہ دیا: (آیہ/۲۰)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً " کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کا سب اللہ نے تمہارے لیئے مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں" یہ بات ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ اس تسخیر کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ چاند، سورج اور زمین و آسمان کی ہر مخلوق انسان کے حکم سے اپنے عمل انجام دیتی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں انسان ہی کے فائدہ کے لیئے بنی ہیں اور وہ ان سے اپنی صلاحیت کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس بیان کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی پیدائش میں اللہ نے اس قدر صلاحیتیں رکھی ہیں کہ وہ کائنات کی دور و دراز پہنائیوں میں جہاں چاہے پہنچ سکتا

ہے چاہے وہ سمندروں کی گہرائیاں ہوں یا فضا کی وسعتیں ہوں اور ہر اس چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اللہ نے اس کے لیئے پیدا کی ہے کیونکہ یہ بڑی صاف سی بات ہے کہ اگر انسان کی پیدائش میں یہ کمال نہ ہو اور یہ صلاحیت و طاقت واقتدار نہ پایا جائے تو پھر قرآن نے انسان کیلیئے جس تسخیر کائنات کا اعلان کیا ہے اس کے کوئی معنی نہ رہیں گے حالانکہ یہ اعلان اللہ کی جانب سے ہے اور اس کی سچائی اور برحق ہونے میں ذرہ برابر بھی شبہہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ مگر بہر حال اس اعلانِ تسخیر کا فائدہ انسان صرف اسی وقت اٹھا سکتا ہے جب وہ خود اپنی ذات اور اپنے خالق کی ذاتِ اقدس کی معرفت حاصل کر لے۔

راہِ حق میں استقامت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا
تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ
الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج
وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ
رَّحِیْمٍ ع (حٰمٓ السجدۃ) آیہ/ ۳۰-۳۲

اور جن لوگوں نے سچّے دل سے اقرار کیا کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے اور پھر وہ اپنے اس کہنے پر قائم رہے اُن پر رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کسی بات کا غم کھاؤ اور تمہیں اُس جنّت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں۔

بہشت میں تمہارے لیئے ہر وہ چیز موجود ہے جسے تمہارا دل چاہے اور جو شئے بھی تم طلب کروگے وہ تمہارے لیئے اس میں

مہیا ہے۔ یہ تمہارے رحمت والے خدا کی طرف سے تمہاری مہمانی ہے"۔ استقامت کے معنی اعتدال کے ہیں اور دوسرے معنی راستہ پر قائم اور جمے رہنے کے آتے ہیں جو اس مقام پہ مراد ہیں اور غرض یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اختیار کر کے اس پہ شدت کے ساتھ قائم رہا جائے مشکلیں پیش آئیں، ہر طرف سے ستایا جائے، مخالفتوں کے طوفان اٹھائے جائیں، قدم قدم پر خطروں کا سامنا کرنا پڑے مگر حق و دیانت سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے (احقاف/۱۳)

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ، جو لوگ عقیدہ توحید اختیار کر کے اس پر جم گئے پھر اُن کے لئے نہ کوئی غم ہوگا اور نہ کوئی خوف و خطر ہو سکتا ہے۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اُن میں مردانِ خدا کی استقامت و صبر کی آزمائش اللہ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک کوئی فرد یا کوئی قوم اس میں پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا

وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ : کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کا امتحان نہ لیا جائیگا۔ (العنکبوت ۲) اس کے بعد کی آیت میں یہ ارشاد ہوا ہے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ - اور بیشک ہم نے ان لوگوں کا بھی امتحان لیا جو ان سے پہلے گذر گئے اور یقیناً خدا جھوٹوں اور سچوں کو الگ الگ کر دے گا اور ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کے علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ پچھلے لوگوں کی استقامت و صبر کا جس طرح امتحان لیا گیا اس کے واقعات قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں اُن میں ایک بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کا قصہ ہے جس کے مختصر سے لشکر نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود ظالم و جابر جالوت کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے قرآنی ارشاد ہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢبِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (بقرہ ۲۴۹) جن لوگوں کے دلوں میں اس کا یقین تھا کہ انھیں خدا کو منہ دکھانا ہے وہ بے دھڑک بول اٹھے کہ ایسا بہت ہوا ہے کہ حکم خدا سے

چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آگئی ہے اور خدا تو ہمیشہ صبر کرنے والوں ہی کا ساتھی ہے۔ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (بقرہ ۲۵۱)

غرض جب طالوت کی چھوٹی سی فوج جس کا خدا پہ پختہ ایمان تھا ظالم و جابر جالوت کے عظیم لشکر کے مقابلہ کے لئے نکلی تو ان سچے ایمانداروں نے خدا کو پکارا اور درگاہِ خداوندی میں فریاد کی:-

اے ہمارے پروردگار ہمیں کامل صبر عطا فرما اور میدانِ جنگ میں ہمارے قدموں کو ثبات عطا کر اور ہمیں کافروں اور مشرکوں پر فتح و کامیابی دے۔ پکارنے والوں کے دلوں میں ایمان اور سچائی کا نور تھا۔ اعتقاد اور یقین میں کمزوری نہ تھی۔ اگرچہ گنتی میں بہت تھوڑے تھے۔ سلاح جنگ بھی کافی نہ تھا مگر اس مٹھی بھر جماعت کے پاس جو سب سے بڑا اسلحہ تھا وہ ان کی ایمانی طاقت، ان کا خلوص، خدا پہ بھروسا

اور حق کی قوت تھی جس پر اعتماد کر کے طالوت کی قلیل جماعت نے جالوت کے ٹڈی دل مسلح لشکر سے ٹکر لی اور اس مضبوط ارادے اور عزم محکم کی بدولت انھوں نے خدا کے حکم سے ان ظالموں کو شکست دیدی۔

حضرت داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اس کے صلہ میں انہیں سلطنت و حکومت عطا کی گئی "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ الخ" اور اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعہ دوسرے لوگوں کا شر اور فساد دور نہ کرتا تو تمام روئے زمین میں فساد پھیل جاتا۔

دوسرا واقعہ اصحاب اُخدود کا ہے۔ یمن میں کچھ ایماندار لوگ تھے جنہیں یہودیوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر میں گڑھا کھود کر اور اس میں آگ سلگا کر اُن اہل ایمان کو اس آگ میں جھونک دیا مگر اس عظیم امتحان کے باوجود وہ راہِ حق سے نہ ہٹے اور اپنے ایمان اور یقین پر جمے رہے، قرآن کریم نے اسی طرح کے اور بھی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں خدا کے سچے ایمانداروں پر ظلم ہوئے، مصیبتیں پڑیں۔ سخت ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر کسی امتحان میں بھی وہ خدا کے راستے سے نہ ہٹے اور اپنی قوّت ایمانی کے ساتھ ہر خطرے اور ہر

مصیبت کا مقابلہ کرتے رہے ۔ ان مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ (البقرۃ ۲۱۴)

۔کیا تم پر گذشتہ لوگوں کے سے حالات نہیں آئے جن پر سے سختیوں اور تکلیفوں کے طوفان گذرتے رہے اور مصیبتوں کے زلزلوں نے انھیں ہلا ڈالا تھا یہاں تک کہ پیغمبر اور جو لوگ ایمان لائے تھے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی " اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ " ۔ اسے خوب کان کھول کر سن لو کہ خدا کی مدد نزدیک ہے ۔ کتابِ خدا نے صبر و ثبات کی تعلیم طرح طرح سے دی ہے ارشاد ہوتا ہے :۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران ۱۴۶)

کتنے ایسے پیغمبر گزر گئے جن کے ساتھ ہو کر خدا والے لوگ لڑتے رہے مگر وہ خدا والے کبھی مصیبتوں کے سامنے ہمت نہ ہارے اور نہ انھوں نے کبھی کمزوری اور ضعف کا اظہار کیا اور نہ کبھی کافروں اور منکرینِ حق سے ایک لمحہ کے لیئے دبے اور ڈرے اور خدا تو

اُن ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو صبر کرنے والے اور ثابت قدم ہیں۔

قدم میں کمزوری صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کو اس کا یقین ہو کہ وہ حق پر نہیں ہے مگر جسے اس کا کامل اعتقاد ہو کہ وہ سچائی کے راستہ پر ہے اور ایک صحیح مقصد کے لیئے کام کر رہا ہے تو اس کے قدموں میں کبھی کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ وہ اسلام و کفر کی لڑائی میں حق پر ہے اور خدا کے حکم سے جہاد کر رہا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ نصرت الہٰی اسی کے ساتھ ہے۔ اسے روشن سورج کی طرح اس کا یقین ہے کہ خدا اس کے ہر عمل اور اس کے ہر ارادہ سے واقف ہے اور وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی ضرور مدد کرے گا۔ تو پھر ایسی حالت میں اس کے دلولہ اور عزم محکم میں کیونکر ضعف پیدا ہو سکتا ہے۔ (نساء/۷۶) میں ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا۔ "ایمان والے تو خدا کی راہ میں جنگ لڑتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے دوستوں اور خدا کے دشمنوں سے جنگ کرو اور کسی بات کی پروا نہ کرنا اس لیئے کہ یقیناً

شیطان کی مکاری اور اس کا داؤں بہت بودا ہے مسلمان جانتا ہے کہ اللہ کی مدد اس کی پشت پر ہے وہ اللہ کا یہ اعلان سن چکا ہے: (انفال/۱۲)

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ ۔ خدا فرشتوں سے فرما رہا تھا کہ میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ایمانداروں کو ثابت قدم رکھنا اور مطمئن رہو میں بہت ہی جلد کافروں کے دلوں میں رعب اور خوف پیدا کردوں گا۔ بس پھر کیا ہے اور اب دیر کا ہے کی ہے ان کافروں کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ اور ان کی پور پور کو چور چور کر ڈالو۔ پھر فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۔ (انفال/۱۶)

اے ایماندار وجب تمہاری اور کافروں کی مڈبھیڑ ہو تو خبردار ان کی طرف سے منہ نہ پھیرنا اور یاد رکھنا کہ اس شخص کے سوا جو لڑائی کے واسطے کترائے یا اس لئے اپنی جگہ سے ہٹے کہ اپنی دوسری جماعت کے پاس جاکر اس کی قوت و طاقت میں اضافہ کرے اور

مل جل کر کافروں کی کمر توڑ دے اگر یہ غرض نہ ہوئی اور صرف بودے پن کی وجہ سے کافروں کا سامنا کرنے سے قدم ہٹائے گا تو یہ یاد رکھو کہ وہ ہر پھر کر خدا کے غضب میں آ چکا ہے اور اُس کا ٹھکانا جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ مسلمانوں کو خدا پر یقین ہے مسلمانوں کی زبان پر لا اِلٰہ اِلاّ اللہ اور محمدؐ رسولُ اللہ کا نعرہ ہے۔ آج پاکستان کے دشمنوں سے فرزندانِ توحید کی جنگ پہلی لڑائی نہیں ہے۔ مُسلمانوں کی تاریخ ایسی جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ مکّہ اور مدینہ کی ابتدائی زندگی سے لیکر آج تک ہم نے ہمیشہ ظلم و جبروت کے بتوں کو توڑا ہے اسی برِّ صغیر کا چپّہ چپّہ ہمارے ثباتِ قدم اور صبر و استقامت کا گواہ ہے۔ حیدر آباد جوناگڑھ اور کشمیر کے بے گناہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ گرانے والے مکّار انسانی درندے خدا کے گھروں پر اور اسپتالوں اور غریبوں کی جھونپڑیوں پر بم گرانے والے بزدل سورما یاد رکھیں کہ انھوں نے فرزندِ گرامی آمنہؓ اور یتیم عبد اللہ کی فوج کو للکارا ہے سومنات اور پانی پت کے شکست خوردہ آباؤ اجداد کی نسل اِس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اُس نے جس قوم کو جنگ کی آواز دی ہے اُس کا ہر فرد محمود غزنوی اور ظہیر الدّین بابر ہے اُس کا

بچہ بچہ سرفروشانہ جذبے اور کفر شکن ولولے رکھتا ہے اور جس طرح میدانِ بدر میں تین سو تیرہ بہادر مسلمانوں نے بغیر اسلحہ اور بغیر سامان کے ہزاروں مسلح کافروں کو نرم شاخوں کی طرح کاٹ ڈالا تھا آج بھی دشمن اپنی کثرت اور ہماری قلّت سے دھوکا نہ کھائے۔ مسلمانوں نے جب بھی دشمنِ اسلام سے جہاد کیا ہے کبھی ان کی کثرت نہیں رہی وہ ہمیشہ قلّت میں رہے اور ہمیشہ اُن ہی نے فتح پائی اور اگر یقین نہ آئے تو اپنی پچھلی قوم کی تاریخ اٹھا کر غور سے پڑھو اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

مسلمان اس راز سے واقف ہے کہ انسان کی عظمت و بزرگی کا صحیح مُقام مصائب کے طوفانوں اور مشکلات کے کٹھن راستوں ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدلنے سے آدمی کا اصلی مرتبہ آشکار نہیں ہوتا جبتک کانٹوں سے بھی اس کا واسطہ نہ پڑے۔ مسلمانوں کے سامنے عزم و ثبات و استقلال کی ایک عظیم تاریخ ہے۔

مسلمان کی نگاہوں میں صبر و استقامت کی نہ بھولنے والی مثالیں موجود ہیں وہ مصیبتوں سے کبھی خوف نہیں کر سکتا

اُس کے قدموں کو دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے جنبش نہیں دے سکتی، اُس کے حوصلے بلند رہنے کے عادی ہیں، وہ برستی ہوئی آگ اور دہکنے والے شعلوں میں مسکرانے کا خوگر ہے، وہ گردن کٹوا دیتا ہے مگر ننگ وعار کے سامنے اور ظلم وجور کے آگے کبھی گردن نہیں جھکاتا۔ تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا ہے آج پھر ہمارے عزم وثبات کا امتحان ہے۔ ہم جس طرح اپنے بہادر آباؤاجداد کی مقدس روحوں کے سامنے جوابدہ ہیں اسی طرح اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے بھی ہمارا کردار اور ہمارا عمل ایک مثال بنے گا۔ آج جس طرح ہم اپنی بہادری، شجاعت خدا پرستی اور ثبات واستقلال کے لئے اپنے گذشتہ اجداد کا ذکر کرتے ہیں اور اُن کے کردار کی روشن شمعوں کو مشعلِ راہ بنا رہے ہیں۔ کل ہماری نسلیں بھی ہمارا ذکر کریں گی اور ہماری مثال کو سامنے رکھیں گی اس لئے میدانِ جنگ میں دشمنِ انسانیت وشرافت دشمن کے مقابلہ میں ہمارا ہر جانباز اور شیر دل سپاہی قیامت تک آنے والے کروڑوں مسلمانوں کے لیئے ایک نہ مٹنے والی مثال ہے۔ سومنات کے پجاریوں نے کعبہ کے پرستاروں سے ٹکر لی ہے تو ان کا وہی حشر ہوگا

جو اصحابِ فیلؑ کا ہوا تھا۔ دشمن کے ٹڈی دل بت پرستوں نے ہاشمی غیرت کو للکارا ہے، محمدؐ عربی کے شیروں کو ستایا ہے مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی طاقت کو دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان کی ایک آواز پر ساری دنیائے اسلام ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح ایک جان اور ایک دل ہو کر کفر و شرک کے اژدہوں کا قلع قمع کرنے کے لیئے کھڑی ہو گئی ہے۔ اور یہ سب اس لیئے ہے کہ ہمیں خود اپنی طاقتوں پر نہیں بلکہ الٰہی طاقت پر بھروسا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم حق کے لیئے جنگ کر رہے ہیں اور ہم پر جنگ کو مسلط کیا گیا ہے تو اب ہم کو بھی یہ ثابت کر دینا ہے کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں کیونکر اور کس طرح ڈالی جاتی ہیں اور ظلم و جور کے نجس اور نفرت انگیز غرور کو کیونکر خاک میں ملایا جا سکتا ہے۔

امدادِ باہمی

امداد باہمی انسان کی زندگی اور اس کی ہر قسم کی ترقی اور کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے اور اسکی فلاح و بہتری کیلئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ جبتک ایک دوسرے کی اعانت اور امداد نہ کرے اور اس کے اچھے اور بُرے میں شریکِ حال نہ بنے اُس وقت تک نہ کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے اور نہ زندگی کے کسی فائدے کو حاصل کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام نے امداد باہمی کے اصول پر جس قدر زور دیا ہے وہ قرآنِ کریم کے ارشادات اور حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی احادیث سے ظاہر ہے۔ اللہ اپنی کتابِ مقدس میں فرماتا ہے (سورۂ مائدہ[۲])

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ "

پرہیزگاری اور نیکیوں میں ایک دوسرے کی اعانت اور مدد کرو مگر برائیوں میں کسی کی مدد نہ کرنا"۔ یہ اسلام کا ایک طے شدہ، لازمی اور مضبوط قانون ہے کہ امداد باہمی صرف اس وقت قابلِ عمل ہو سکتی ہے جب اس کا مقصد نیک ہو اور اس کی غرض تخریبی نہیں

بلکہ تعمیر ہو" امداد باہمی " ایک مختصر سا جملہ ہے لیکن اس کے معنی بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ انسان کی زندگی کے جتنے بھی پہلو ممکن ہو سکتے ہیں خواہ اس کی ذاتی زندگی ہو، گھریلو زندگی ہو یا اس کا کسی معاشرہ، جماعت اور کسی ملک سے تعلق ہو۔ ان سب ہی صورتوں میں ایک کا دوسرے کی مدد کرنا انسانی ترقی اور اس کے پھلنے پھولنے اور تمام کامیابیوں کا سب سے بڑا سبب بن سکتا ہے۔ انسان اُس وقت ہی سے جب وہ ماں کے شکم میں زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں داخل ہوتا ہے اسی تعاون اور امداد کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اگر یہ مدد اسے حاصل نہ ہو تو وہ ایک لمحہ میں زندگی کی نعمت سے محروم ہو جائے۔ جب وہ اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اُس وقت بھی وہ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور ایک لمحہ کے لیئے بھی وہ اس امداد و اعانت سے بے نیاز نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد جس قدر اس کی عمر آگے بڑھتی جاتی ہے اور اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کو دوسروں کی مدد کی طرف احتیاج زیادہ ہوتی ہے۔ وہ جب بیمار پڑتا ہے تو اسے علاج کرنے والوں اور تیمار داری کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو

اسے استادوں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب وہ کہیں جانا چاہتا ہے تو اسے سواریوں کی ضرورت پڑتی ہے غرض کھانے پینے رہنے سہنے، بیماری، تعلیم، نسلی و ازدواجی مسئلے، گھریلو اور قومی و ملکی امور سب ہی ہیں وہ امداد باہمی اور آپس کے تعاون کا ہر قدم پہ محتاج ہے۔ انسانی زندگی کا کونسا ایسا شعبہ اور اس کے راستوں کا کونسا ایسا موڑ ہے جہاں وہ دوسروں کی اعانت کے حاصل کرنے سے بے نیاز ہو۔ اسی تعاون اور باہمی امداد پہ پورے انسانی معاشرے کی بقا اور اس کے تمام افراد کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے اگر آپس کا تعاون باقی نہ رہے تو ایک چھوٹے گھر کی طرح پورا معاشرہ بھی تباہ ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک آسان مثال یہ بھی ہے کہ جس طرح انسان کے خود اپنے بدن میں مختلف اعضاء ہوتے ہیں۔ اگر ہاتھوں کی مدد پیروں کے ساتھ شامل نہ ہو، اگر آنکھیں اعانت نہ کریں، اگر کان سننے کا کام انجام نہ دیں۔ مختصر یہ کہ اگر اعضائے بدن کی یکجہتی اور باہمی امداد باقی نہ رہے تو آدمی کوئی کام بھی پورا نہیں کر سکتا اور اس کا جسم بالکل معطل اور بیکار ہو کر رہ جائے گا بس یہی صورت انسان کی باہمی زندگی کی بھی ہے۔ ایک معاشرہ یا قوم بھی ایک بدن

ہے اس کے بھی اعضا ہیں اور وہ ہیں اس کے افراد اور وہ لوگ جو اس کے اندر رہتے اور زندگی کے ہر فائدے کو حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح جسم کے اعضا اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور انسان کے مقصد کو پورا کرنے میں پوری یک جہتی اور منظم باہمی تعاون سے کام کرتے ہیں اور جو فرض جس عُضو کا ہوتا ہے وہ اس کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش میں لگا رہتا ہے اسی طرح ایک ملک اور معاشرے کے تمام افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنے اجتماعی مقاصد کو پورا کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔ اور مکمّل یکجہتی پورے عزم و ہمّت اور انتہائی خلوص، نیک دلی اور سچّائی کے ساتھ امدادِ باہمی کے فرض کو پورا کریں۔ اگر کوئی فرد اپنے ان فرائض میں کوتاہی کرے گا تو اسے اُس ملک اُس سرزمین اور اُس معاشرے میں نہ رہنے کا حق ہے اور نہ اُس سے کسی فائدے کے حاصل کرنے کا استحقاق ہو سکتا ہے۔ اسلام نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جاں چیزوں کے بھی حقوق ہیں۔

جن کو پورا کرنا اس کا فرض ہے۔

یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی بنیادی باتیں ہیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ وَحَقُّ الْمُسْلِمِ عَلٰی اَخِیْہِ الْمُسْلِمِ اَنْ لَّا یَشْبَعُ وَیَجُوْعُ اَخُوْہُ وَلَا یَرْوِیْ وَیَعْطَشُ اَخُوْہُ وَلَا یَکْتَسِیْ وَیَعْرٰی اَخُوْہُ۔"

بیشک ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اس برادری کا حق یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان بھوکا ہو اور دوسرے کے پاس کھانا موجود ہو تو جبتک وہ اُس بھوکے مسلمان کا پیٹ نہ بھر دے اور اُس کا شکم سیر نہ کر دے خود بھی بھوکا رہے، اگر ایک مسلمان پیاسا ہو اور دوسرے کے پاس پانی موجود ہو تو وہ اُس وقت تک خود بھی پیاسا رہے جبتک اپنے مسلمان بھائی کو سیراب نہ کر دے۔ اگر کسی مسلمان کے پاس کپڑے نہ ہوں اور دوسرے کے پاس لباس موجود ہو تو وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیئے لباس فراہم کرے اور جب تک اُس کے لیئے لباس میسّر نہ ہو خود بھی تکلیف اٹھائے

حضرت سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ فِیْ تَرَاحُمِھِمْ وَتَعَاطُفِھِمْ بِمَنْزِلَۃِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ

اذا اشتکی منہ عضو واحد تداعی لہ سائر الجسد بالحمی والسھر"

تمام مسلمان باہمی اخوت و برادری اور آپس کے تعاون کے سلسلہ میں ایسے ہیں جیسے ایک جسم ہوتا ہے۔ جب اس کا کوئی عضو دکھتا ہے تو سارا بدن تکلیف سے بے چین ہو جاتا ہے۔ ایران کے مشہور شاعر سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

چو عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

تو کز محنت دیگران بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

جب جسم کے ایک حصہ میں درد پیدا ہو جاتا ہے تو پورا بدن بے قرار ہو جاتا ہے۔ اگر آنکھ میں مٹی کا ایک چھوٹا سا ذرہ پڑ جاتا ہے تو رات بھر نیند کیوں نہیں آتی، اگر انگلی میں کوئی کانٹا چبھ جاتا ہے تو سارا بدن کیوں مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے، اگر ایک انسان دوسرے انسانی بھائی کی تکلیف اور درد کا احساس نہ کرے تو وہ آدمی کہے جانے کا قطعی طور پر حق نہیں رکھتا۔ یہ تعاون اور باہمی امداد کا طریقہ اسلام کا بنیادی اصول ہے اسلامی تحریک اور خدا پرستی کی منظم تبلیغ سے قبل حضرت پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کو اسی اخوت اور باہمی تعاون کے اہم اصول سے آگاہ فرمایا تھا، رنگ و نسل اور قوم و

وقبیلہ، سرداری وغلامی، ملکی اور غیر ملکی کے فرق کو مٹا کر ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ اسی اصول زندگی کو قرآنِ کریم نے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کہکر واضح کیا ہے۔ جتنے مسلمان ہیں وہ سب کے سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور جب دو آپس میں بھائی ہیں تو پھر ان کو ویسے ہی برتاؤ کرنے کی ضرورت ہے۔ جو حقیقی اور محبت کرنے والے بھائیوں میں کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے باہمی مفاد کی اہمیت پر اس قدر کثرت سے احادیث اور ارشادات نبوی موجود ہیں جن کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا جا سکتا ہے اور اس سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس اصول کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ "مَنْ اَعَانَ اَخَاہُ الْمُؤْمِنَ عَلٰی سُلْطَانٍ جَائِرٍ اَعَانَہُ اللّٰہُ عَلَی الصِّرَاطِ عِنْدَ زَلَّۃِ الْاَقْدَامِ"۔ جو اپنے مسلمان بھائی کی امداد کرے ظلم وجور کے مقابلہ میں تو اللہ اس بندۂ مؤمن کی اس وقت قیامت کے روز اعانت فرمائے گا جب پل صراط پر اُس کے قدم ڈگمگا رہے ہوں گے۔ شیر خدا فاتحِ خیبر حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کا ارشاد ہے:

فَاِذَا کُنْتَ مِنْ اَخِیْکَ عَلٰی حَدِّ الثِّقَةِ فَابْذُلْ لَهٗ مَالَکَ وَبَدَنَکَ وَصَافِ مَنْ صَافَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ" سچی اخوّت اور برادری کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے مال اور اپنی جان کو اپنے مسلمان بھائی سے عزیز نہ کرو اور یہی نہیں بلکہ جس سے وہ محبّت رکھتا ہو تم بھی اسے دل سے چاہو اور جو اس مسلمان بھائی کا دشمن ہو اس کو تم بھی اپنا دشمن سمجھو اور اس سے کبھی دوستی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارے دوست کا دشمن ہے۔ فرزند رسولؐ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں "مَا مِنْ مُؤْمِنٍ بَذَلَ جَاهَهٗ لِاَخِیْهِ الْمُؤْمِنِ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ عَلَی النَّارِ وَلَمْ یَمَسَّهٗ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ" مؤمن اپنے برادر مؤمن کے لیئے اپنے اقتدار اور اپنے اثرات اور اپنی قوت و طاقت صرف کرلے گا خدا قیامت کے دن جہنم کی آگ کو اس پر حرام کرے گا۔ اور اسے اس خدمت کے صلے میں روز محشر کوئی ذلّت و رسوائی حاصل نہ ہوگی۔

باہمی امداد کا اصول قرآن کریم اور اسلام کے بتائے ہوئے راستوں پر انسانی کامیابی کے لیئے اور اس کی فلاح و بہبود کے لیئے انتہا ضروری ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" تم سب کے سب خدا

اور ایمان کے رشتہ کو مضبوط تھام لو اور ایک دوسرے کے شریک حال بن جاؤ اور اتحاد کے راستہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ (آل عمران/۱۰۳)

مسلم قوم ایک جسم ہے، ایک دیوار ہے، ایک خاندان ہے جسکی بنیاد اخوتِ اسلامی پر قائم ہے جب اعضا جمع ہوتے ہیں تو جسم بنتا ہے جب اینٹیں اکٹھا ہوتی ہیں تو دیوار بنتی ہے اور سب افراد یکجا ہوتے ہیں تو خاندان کی تشکیل کی جاتی ہے۔ اس لیئے اسلام کے زرّیں اصول کو سامنے رکھ کر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ سب باتوں کو بھول کر ایک دل اور ایک جان بنکر اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کریں اور اس مقابلہ میں ایک آہنی دیوار بن کر ملک وقوم کی خدمت کا فرض انجام دیں جس طرح ایک جسم کے اعضا اور ایک خاندان کے افراد مختلف فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں اسی طرح ایک مملکت کے افراد کے بھی فرائض مختلف اور جدا جدا ہوتے ہیں کوئی کھیتوں میں اناج پیدا کرتا ہے، کوئی شہروں میں امن وامان قائم کرتا ہے کوئی بیماروں کا علاج کرتا ہے کوئی مصیبت زدہ لوگوں کی امداد واعانت کرتا ہے اور ملک وملت کے بچاؤ میں اپنا سب

کچھ قربان کردیتا ہے جو اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے اور اسی لیئے دشمنِ اسلام سے جنگ کرنے میں جو اپنی جان پیش کر دے اس کو اللہ کی بارگاہِ قدس سے شہادت کا شرف اور ابدی زندگی کی جاگیر عطا کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے ایک سرزمین کی حفاظت کی ہے، ایک ملک کو بچایا ہے، کفر و الحاد اور شرک و شیطنت کے حملوں سے، وہ ملک اور ایسی سرزمین جس پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے جس پر لا الٰہ الا اللہ کہنے والے بستے ہیں اور جس پر محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لینے والے زندگی بسر کرتے ہیں بیشک وہ شہید ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کی خاطر جان دے، وہ زندۂ جاوید ہے، اسکو موت کبھی نہیں آسکتی جس کے خون کے قطروں نے لاکھوں معصوم بچوں کی جانیں اور مسلمان عورتوں کی عزتیں بچائیں۔ بیشک وہ ہر امداد ہر اعانت اور ہر طرح کی نصرت کا مستحق ہے جس نے جان دے کر مسلم قوم کی رگوں میں عزم دشمن کی قیامت تک نہ بجھنے والی آگ کے شعلے دہکا دیئے اور اسلامی اخوت و برادری کی دیوار کو اتنا مضبوط کر دیا کہ اب کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ نہیں ہمارے مقدس

نبیؐ نے بتا دیا ہے جو شخص مجاہدین اسلام کی کسی طرح بھی مدد کرتا ہے وہ بھی جہاد اسلامی میں برابر کا شریک ہے اور اُسے بھی وہی ثواب عطا کیا جائے گا جو میدان جنگ میں اترنے والے اور کفر سے نبرد آزمائی کرنے والے کو ملتا ہے اور اس اعانت ونصرت کرنے والے کو بھی شہیدوں کی صف میں قیامت کے روز جگہ ملے گی۔

ہماری تاریخ باہمی تعاون اور اتحاد واتفاق کی تاریخ ہے، اور اسیطرح باہمی محبت واخوّت اور تعاون سے ہم نے ہمیشہ دشمنانِ اسلام کے دانت کھٹے کئے ہیں۔ کبھی ہم نے دھوکے بازی یا کثرت لشکر کے ذریعہ فتح حاصل نہیں کی بلکہ ہمیشہ سچائی، عزم محکم اور ایمان کی طاقت اور آپس کے اتحاد و اخوّت کے عظیم جذبہ اور ناقابل تسخیر ولولے کیساتھ کامیابی حاصل کی ہے۔ بدر کی لڑائی سے کربلاء کی جنگ تک اور کربلاء سے آجتک اسلامی تاریخ کا ہر ورق ہمارے عزم اور باہمی تعاون کا ایک شاہکار ہے۔ ہم نے مدینہ اور مکہ میں مسلمانوں کے باہمی تعاون دیکھا ہے۔ ہم نے عربستان سے لیکر دنیا کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی یکجہتی اور اخوّت دینی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہمارے سامنے بدر کے تین سو تیرہ سرفروش

مسلمانوں کی یکجہتی کا منتظر ہے ۔ ہم کربلا کے ۷۲ بھوکے اور پیاسے جانبازوں کی قربانیوں سے واقف ہیں ۔ ہم نے اُن ماؤں کو بھی تاریخ کے زرین اوراق پر دیکھا ہے جن کے سامنے کربلا کے میدان میں اُن کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر ظالم فوج کی طرف سے پھینکے گئے ۔ اور اُن ماؤں نے اُن سروں کو چوم کر خدا کا شکر ادا کیا اور پھر انھیں ظالموں کی طرف واپس کر دیا ۔ اور کہا کہ ہم خدا کی راہ میں جو ہدیہ دیدیتے ہیں اس کو واپس نہیں لیتے ۔ آج بھی ہماری یکجہتی اور امداد باہمی اور تعاونِ دینی کا پھر امتحان لیا جا رہا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی روحوں کے سامنے ، اپنے مقدس رسولؐ اور اُن کی آلؑ اطہار و اصحابؓ کبار اور اپنے اللہ کے سامنے اپنے فرض کو ادا کر کے اسلام اور حق کا نام بلند کریں گے اور اسلامی تاریخ میں ایک سنہرے وَرَق کا اضافہ کریں گے ۔

کبر و غرور

فخر و غرور اُن اخلاقی بنیادوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے
جن پر اسلام نے انسانی معاشرہ کی تعمیر کی ہے۔ جہاں تک احساسِ کمال کا تعلق ہے یہ امر فطری ہے کہ ہر انسان کسی حد تک اپنے دل میں اس کی جگہ رکھتا ہے لیکن یہی احساسِ کمال اگر دوسروں کی تحقیر کا سبب بن جائے اور کوئی شخص اپنے مقابلہ میں دوسرے کو ذلیل سمجھنے لگے تو اسے غرور اور "تکبر" کہیں گے اور یہ ایک ایسی قابلِ مذمت کیفیت ہے جو بے شمار برائیوں اور انتہائی خطرناک نتائج کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس موقع پر "کبر و تکبر" دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ کبر اُس نفسانی کیفیت کا نام ہے اور "تکبر" اُس کیفیت کے اظہار اور عملی پہلو کو کہتے ہیں۔ بہر حال اس مذموم صفت کے جو بدترین نتیجے سامنے آتے ہیں وہ شمار نہیں کیے جا سکتے اور جہاں تکبر کی وجہ سے آدمی پورے انسانی معاشرہ سے علیحدہ ہو کر رہ جاتا ہے تو ساتھ ہی اسکی ترقی کے سارے ہی دروازے بند

ہو جاتے ہیں اس لیئے کہ وہ اپنے آپ کو ہر شخص سے بڑا سمجھنے لگتا ہے اور اپنی ذات میں کسی قسم کی کوئی کمی اور عیب یا کمزوری نہیں پاتا جس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اس بری عادت کی وجہ سے وہ دوسروں سے نفرت کرتا ہے اور پھر یہ ظاہر بات ہے کہ دوسرے بھی اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

وہ ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ ہر شخص اسکی تابعداری کرے اور اُسکو بڑا سمجھے اور اس کے سامنے اس کا سر اطاعت جھکا رہے اور جب اسکی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی تو آپس کی نفرت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے اور اسکے نتیجہ میں ظلم و زیادتی، نا انصافی، حق تلفی اور طرح طرح کے فسادات رونما ہوتے ہیں جن سے معاشرہ کا امن و سکون ختم ہو جاتا ہے اور ہر طرف افراتفری کا دور دورہ ہونے لگتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔

"جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر و غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

علماءِ کرامؒ نے اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ایک مخلص اور سچے مسلمان کی جو خاص صفتیں ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں اور تکبر و

غرور ان دروازوں کو بند کر دیا کرتا ہے اس لیے حضرت نبیؐ اکرم کے ارشاد کے مطابق جس کے دل میں ذرا سا بھی غرور پایا جائے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ انسانی معاشرہ کے ہر طبقہ میں اس بُرائی اور بداخلاقی کا وجود ہے اور اسکی بے انتہا شاخیں اور اثرات ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹا اور ننھا سا بیج بڑھ کر ایک بڑا درخت بن جاتا ہے اور اس میں سیکڑوں پتیاں اور شاخیں نکل آتی ہیں اور وہ پھیل کر ایک وسیع رقبہ کو گھیر لیتا ہے بالکل اسی طرح کبر و غرور کا بیج جب دل میں پرورش پاتا ہے تو اس کی شاخیں نکلتی ہیں اور یہ پھیل کر انسان کے دل و دماغ کے سارے حدود پر چھا جاتا ہے اور آخر میں خود اس کی اور اس متکبر و مغرور انسان کی وجہ سے پورے معاشرہ کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ کبر و نخوت میں خود پسندی کے مذموم اور برے جذبہ کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر اور پستی کا غلط احساس پوری شدت سے موجود ہوتا ہے۔ اس لیئے مغرور و متکبر لوگ دوسروں کے ساتھ ربط و ضبط رکھنا اور اُن کے پاس بیٹھنا، اٹھنا بھی اپنی بے عزتی اور اپنی شان کے خلاف سمجھنے لگتے ہیں اور کبھی تو وہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ غلاموں کی طرح انکے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے

رہیں اور ان کی چشم و ابرو پر گھومتے رہیں۔ ایسی ہی اخلاقی بیماریوں کے لیے سرور دو عالم فرماتے ہیں: "جو شخص اس کا خواہشمند ہو کہ اسکے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے"

حدیث میں ہے ایک بار خود سرکار دو عالم عصا ٹیکتے ہوئے نکلے تو اصحاب کرام سب کے سب تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے آپ نے فرمایا کہ اس طرح کی تعظیم جو تمہارے پڑوسی ملکوں کے درباری کیا کرتے ہیں تم نہ کیا کرو۔ کبر و غرور کے بعض پہلو قرآن کریم کی ان آیات میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے: تم زمین میں اکڑ کر نہ چلا کرو کیونکہ نہ تو تم اپنی اس غرور بھری چال سے زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتے ہو۔ دوسری جگہ حضرت لقمانؑ کی ان نصیحتوں کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے فرزند کے لیئے کی تھیں۔ لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، زمین پر اترا کر نہ چلنا، بیشک اللہ اس آدمی کو پسند نہیں فرماتا جو مغرور اور متکبر اور بڑا فخر کرنے والا ہو۔ (لقمان / ۱۸)

انسان کی طبیعت میں یہ بری کیفیت جن امور سے پیدا ہوتی ہے وہ حسن، دولت، خاندان، جسمانی طاقت، عہدہ اور اقتدار، پر ساتھیوں کی کثرت یا علم و کمال کا حصول ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن

کریم نے کچھ جامع اصول بتائے ہیں جن سے شرافت اور حقیقی عزت و بزرگی کا صحیح معیار معلوم ہو جاتا ہے۔ اور جو غرور اور تکبر کی بنیاد ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً (حجرات/۱۳) "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" تم میں سب سے زیادہ عزت والا خدا کے نزدیک صرف وہ ہے جو ایمان اور تقویٰ کے لحاظ سے تم سب میں افضل ہو۔ یا رسولؐ کریم کا اعلان کہ: لَیْسَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰی" عرب کو عجم پر اگر فضیلت حاصل ہو سکتی ہے تو صرف پرہیزگاری کے ذریعہ ورنہ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے"۔ تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جس کا علم سوائے اللہ کے جو دلوں اور نیتوں کے حال سے واقف ہے کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی شخص کے لیئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ یہ بتا سکے کہ ایمان و پرہیزگاری میں کس آدمی کا مرتبہ زیادہ ہے اور کس کا کم ہے کسی بڑے صاحبِ دولت و اقتدار کا یا کسی انتہائی غریب و محتاج کا۔

ابھی یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ تکبر کے لیئے صرف اپنی بڑائی کا خیال ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہی دوسرے کی تذلیل و تحقیر کا جذبہ بھی ذہن میں پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ ہم بڑے اور اچھے ہیں اور دوسرا ہم سے چھوٹا اور کم حیثیت ہے۔ خود اپنے مقام پر پہلی بات

بھی اخلاقی حیثیت سے قابل مذمت ہے کیونکہ وہ بھی انسان کے ذہنی ارتقاء اور ہر قسم کی ترقیوں کو روکتی ہے اور بہت سی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے لیکن جس وقت اس میں دوسروں کی تحقیر کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے تو اس کی بُرائی اور تباہ کاری کی حد نہیں رہتی۔ سب سے پہلا تکبر کرنے والا شیطان تھا جس نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں غرور کا اظہار کیا اور خدا کی بارگاہ میں اس کا دعویٰ کیا کہ "اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ" میں آدمؑ سے افضل، اعلیٰ اور بہتر ہوں۔ جس کے جواب میں اللہ کا یہ فرمان آیا:

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ الآیۃ (اعراف/۱۳)

تجھے یہ غرور ہے تو بہشت سے نیچے چلا جا، مگر تیری یہ مجال نہیں کہ تو یہاں رہ کر تکبر کرے تو یہاں سے باہر نکل جا بیشک تو ذلیل لوگوں میں سے ہے۔ قرآن کریم میں اس بدترین بداخلاقی کا بار بار ذکر کیا گیا ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: (الزمر/۶۰)

اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ۔ کیا جہنم میں مغرور لوگوں کا ٹھکانا نہیں ہے یعنی ضرور ہے۔ ایک جگہ یہ الفاظ ارشاد ہوئے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ (نساء/۳۶)

اللہ کسی اکڑنے والے اور شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا۔

حدیث نبوی کے یہ الفاظ بھی ہمارے سامنے ہیں۔
اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَھْلِ النَّارِ کُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَکْبِرٍ" میں تمکو بتاؤں کہ اہل جہنم کون لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جو بدذات اور ظالم ہوں اور اکڑ کے چلنے والے اور مغرور و متکبر ہوں۔

اسلام انسانی معاشرے میں ہم آہنگی چاہتاہے اور ہر فرد کی عزت و آبرو اور حیثیت وحقوق کو محفوظ کرنے کا خواہشمند ہے جس سے ایک صالح معاشرہ اور صحتمند انسانی ماحول وجود میں آسکے اور کبر وغرور چونکہ اس کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ اور ایک زہریلا ناسور ہے اس لیئے قرآن حکیم اور نبی کریم نے اس کے عظیم خطرہ سے انسان کو آگاہ فرما کر اس سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

اطمینانِ قلب

اطمینانِ قلب سے مراد یہ ہے کہ انسان مصیبتوں اور خوف یا ہراس کے موقع پر مضطرب اور پریشان نہ ہو اور اپنے ذہنی توازن میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دے۔ درحقیقت یہی ایک پکے اور سچے مؤمن کی شان ہے۔ قرآنِ حکیم میں جا بجا اس اطمینانِ قلب کی تعریف کی گئی ہے اور اسے ایمان کی سب سے بڑی علامت قرار دیا گیا ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیثوں میں بھی کثرت کے ساتھ ایمان کی اس سب سے بڑی بنیادی صفت کا ذکر موجود ہے جس سے یہ بات سورج کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ جس شخص کے دل میں اطمینان کی کیفیت نہ ہو وہ کسی طرح سچا مؤمن اور پکا مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔ سورۂ رعد پ ۱۳ رکوع ۹ آیت ۲۸ میں اللہ نے ان لفظوں میں اطمینان قلب کی تعریف فرمائی ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

یہ سچے مسلمان وہ لوگ ہیں جنہوں نے دل سے ایمان اختیار کیا اور ان کے دلوں کو ذکر خدا یعنی اللہ کی یاد سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی مسلمان کو اللہ کی طاقت وقدرت پر یقین کامل ہے اور وہ اسے خوب سمجھتا ہے کہ اللہ اس کی ہر راحت ومصیبت اور آرام وتکالیف سے پوری طرح باخبر ہے اور جب اس کے بندہ کو ضرورت ہوگی تو وہ اس کی نصرت فرمائے گا اور اُسے اس کا بھی کامل یقین ہے کہ الٰہی طاقت وقوت کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت بھی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی تو یقیناً اس اعتقاد کے نتیجہ میں وہ اطمینان وسکون پیدا ہوگا جو کسی دوسرے سہارے سے پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔

اسی بات کی طرف اس جملہ سے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ "دلوں کا اطمینان تو خدا کی یاد ہی سے حاصل ہوتا ہے"۔ بشرطیکہ وہ یاد یقین محکم کی حد پر ہو اور صرف وہم اور تخیل نہ ہو۔

اطمینانِ قلب کے ایک خاص تاریخی منظر کو قرآن حکیم میں اللہ نے سورۂ آل عمران ۱۲۶ اور سورۂ انفال ۱۰ میں بیان فرمایا ہے:-

جنگ بدر میں مسلمانوں کی قلت اور دشمن کی کثرت کا ذکر ہے (آل عمران پ ۴ رکوع ۱۳ ۱۲۳) ارشاد ہو رہا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ' " اللہ نے جنگ بدر میں تمہاری اس وقت مدد فرمائی جب تم دشمن کے مقابلہ میں بالکل بے سہارا، بے سروسامان تھے۔ یعنی اس وقت مسلمانوں کے پاس نہ تو اسلحہ اور رسد اور دوسرا سامان جنگ موجود تھا اور نہ ان کی تعداد ہی ایسی تھی جس سے وہ اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکتے"۔ اس وقت اللہ نے فرشتوں کے لشکر سے ان بہادر اور جانباز مسلمانوں کی مدد کی جن کے دل دولت ایمان سے بھرے ہوئے تھے اور جو سامانِ جنگ اور تعدادِ لشکر کی انتہائی کمی کے باوجود اپنے بے پناہ عزم و اطمینان کے ساتھ دشمن کی بھاری فوج کے سامنے جمے ہوئے تھے۔ پھر مسلمانوں نے دشمن کے ہتھیار چھین چھین کر جنگ شروع کر دی اور مشرکین مکہ کے ستر نامی نامور سرداروں کو قتل کر دیا جس میں کم سے کم ۲۲ بہادر صرف شیرِ خدا حضرتِ علی بن ابی طالب علیہ السلام کے

دستِ حق پرست سے جہنم واصل ہوئے۔ اگر اس وقت کے مسلمان عزم وہمت اور اطمینانِ قلب سے کام نہ لیتے تو آج دنیا میں مسلمانوں کا نشان بھی نہ ہوتا۔ اسی تذکرہ میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (آل عمران ۱۲۶)

اور فرشتوں کے ذریعہ سے خدا نے جو تمہاری مدد فرمائی تو اسے تمہارے لئے خوشخبری قرار دیا اور تاکہ تمہارے قلب مطمئن ہو جائیں (اور یہ تو ظاہر بات ہے) کہ مدد تو صرف اس خدا کی جانب سے ملتی ہے جو سب پر غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

یہ "اطمینانِ نفس" مؤمن کی وہ عظیم صفت ہے جسے رضائے الٰہی کی نشانی اور داخلۂ جنت کی ضمانت قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب روح مؤمن اس جسمِ خاکی سے جدا ہوتی ہے تو اس کی طرف خدائے قدوس کی جانب سے اس طرح خطاب ہوتا ہے:-

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (سورۃ الفجر پ ۳۰ ۲۷-۳۰)

اے مطمئن روح تو اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ اس طرح کہ تو اس سے خوش ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو"، اسلامی تاریخ اطمینانِ قلب کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے، اللہ کی یہی ہدایت ہے، قرآنِ حکیم کا یہی سبق ہے، حدیث کی یہی آواز ہے اور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم کی یہی زندگی تھی۔

"ربذہ" کے صحرا میں بھوک اور پیاس سے دم توڑتے ہوئے حضرت ابوذرؓ نے اسی اطمینانِ قلب کا مظاہرہ کیا تھا حضرت خبابؓ بن ارتؓ صحابی نے اس وقت جب انھیں منکرین کے درندوں نے جلتی ہوئی آگ پر لٹا دیا تھا اسی ایمان محکم اور اطمینانِ قلب کا اظہار کیا اور اُف تک نہ کی۔ حضرت بلالؓ جلتی ہوئی ریت پہ لٹائے جاتے تھے اور پتھر کی بھاری چٹان اُن کے سینہ پر رکھدی جاتی تھی اور گلے میں رسی باندھ کر گھسیٹا جاتا تھا۔ مگر اُن کی زبان پر "اُحد اُحد" ایک خدا ایک خدا کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کا یہی اطمینانِ قلب تھا جس سے قیصر و کسریٰ اور کرۂ زمین کے سارے سرکشوں کی طاقتیں ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں اور اسلام کا

پرچم زمین کے ہر حصے پر لہرانے لگا یہی وہ اطمینانِ قلب تھا جس کا کامل ترین مظہر خود رسولِ عربی کی ذاتِ اقدس تھی اور کفر و شرک و طاغوتیت کی کوئی طاقت حضورؐ کے قدم کو کسی میدان میں جنبش نہ دے سکی اور یہی تو وہ اطمینان قلب تھا جسے فاتحِ خندق و خیبر حضرت حیدرِ صفدر علیہ السلام کے کفر شکن حملوں میں اور آپ کے مثالی ثباتِ قدم میں ساری دنیا نے دیکھا اور یہی وہ اطمینانِ قلب تھا جسے معرکۂ کربلا میں حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے اور آپ کے ہر ساتھی نے دکھایا تھا اور حد یہ ہے کہ امامؑ عالی مقام کے قاتل یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ: ہم نے آج تک ایسا بہادر نہیں دیکھا جو اس طرح خونخوار دشمنوں میں گھرا ہوا ہو اور اس کی اولاد اور تمام ساتھی قتل کر دیئے گئے ہوں پھر بھی وہ اس طرح مطمئن ہو اور اس کے ثباتِ قدم میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے۔" بلاشبہ اطمینانِ قلب اور ثباتِ قدم اور صبر و رضا ہی سچے مسلمانوں کا امتیازی نشان ہے اور یہی وہ عظیم طاقت ہے جس نے اسلام کے دشمنوں کو ہمیشہ عبرتناک سزائیں دی ہیں اور ان کے غرور و نخوت سے بھرے ہوئے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے روندا ہے۔ آج بھی

اُمّتِ مُسلمہ کی رگوں میں وہی گرم ایمانی خون ہے اور اُن کے دلوں میں وہی تاریخی اطمینان موجود ہے۔ ہماری صفوں میں رنگ، نسل، زبان اور خطّہ کا کوئی سوال موجود نہیں ہے۔ ہم جہاں بھی ہیں کلمہ گو اور مسلمان ہیں اور اللہ کے سپاہی ہیں اور آپس میں پوری طرح متحد و متفق اور چٹان کی طرح ایک جان ہیں ہمارے سروں پر الٰہی نصرت و حفاظت کا سایہ ہے۔ ہمارے ایک ایک فرد کے پاس اطمینانِ قلب اور صبر و ثبات اور شجاعت کا بے پناہ اسلحہ موجود ہے۔ دشمنانِ اسلام کے بزدل اور کمینے سپاہیوں کے ناپاک قدم ایک لمحہ کے لیئے بھی ہماری پاک سرزمین پر نہیں ٹھہر سکتے۔ ہم ان آنکھوں کو اندھا کر دیں گے جو سرزمینِ اسلام کی طرف بُری نیّت سے دیکھیں گی اور اُن پیروں کو کاٹ دیں گے جو ناپاک ارادہ سے ہماری مقدس سرزمین کی طرف بڑھیں گے۔

ثابت قدمی

ثابت قدمی جس طرح اچھے اور نیک کاموں میں ہو سکتی ہے اسی طرح بُرے کاموں میں بھی ہو سکتی ہے - لیکن ظاہر ہے کہ بُرے کام تو خود ہی بُرے ہیں تو ان میں ثابت قدمی بھی حد سے زیادہ بُری چیز ہو گی اس لیئے وہی ثابت قدمی جائز وصحیح اور قابل تعریف ہے جو نیک کاموں میں ہو- اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کسی نیک ارادہ یا عمل میں جما رہے اور وہ کسی مصیبت اور تکلیف میں بھی مبتلا ہو، اس پر کتنی ہی مشکلیں پڑیں اور کیسے ہی خطرے اس کے سامنے آئیں مگر وہ اپنے نیک راستہ پر قائم رہے اور اس کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑے - ثابت قدمی کا تعلق انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے ہو سکتا ہے - جہاں بھی اس کا امکان اور ضرورت ہو خواہ

اس کا تعلق ارادہ اور شعور و اعتقاد سے ہو یا اعمال و افعال سے ہو۔ غرض انسان کا فرض ہے کہ وہ نیک بات کو اختیار کرے اور اس پر پوری مستعدی کے ساتھ جا رہے لیکن یہ بہر حال ضروری ہے کہ وہ اس نیک بات کی پوری طرح تحقیق کر لے کہ وہ واقعی نیک اور درست ہے اور اس کی تحقیق میں اس کے لیئے لازمی ہو گا کہ وہ اُن وسائل اور ذرائع کو اختیار کرے جو اس کو حق و صداقت تک پہنچا سکیں ورنہ اگر اس نے غلط اور باطل وسیلے اختیار کر لیئے تو اس کا نتیجہ بھی ضلالت و گمراہی کے سوا کچھ بھی نہ ہو گا اور اس پر ثابت قدمی کا نتیجہ بھی ویسا ہی مہلک اور تباہ کن ہو گا جو برائیوں پر ثابت قدمی کا ہو سکتا ہے۔ ثابت قدمی کے لفظی معنی تو بس اسی قدر ہیں کہ آدمی اپنے قدم کو قائم و ثابت رکھے اور جمائے رہے، لیکن اخلاق کے ذکر میں جہاں کہیں اس کا بیان ہوتا ہے تو اس کا مطلب ظاہری قدم نہیں ہوتا بلکہ باطنی قدم ہوتا ہے یعنی ہم اپنے ذہن و ضمیر کو کسی نیک مقصد پر جمائے رہیں اور پھر ظاہر ہے کہ ہمارے اعمال و افعال بھی اسی شعوری ثبات و قرار ہی کے مطابق ظاہر ہوتے رہیں گے۔ قابل تعریف تو صرف وہی

نیک افعال ہوا کرتے ہیں جو آدمی اپنے اختیار سے عمل میں لاتا ہے مجبور ہو کر کسی مشین کی طرح اس سے اگر کوئی اچھا کام ظہور میں آجائے تو وہ کتنا ہی مفید اور اچھا ہو لیکن وہ آدمی جس سے وہ کام بغیر نیت و ارادہ کے محض مجبوری اور قطعاً غیر اختیاری صورت میں وجود میں آیا ہے قابل تعریف نہیں ہو سکتا اس لیئے ثابت قدمی بھی وہی قابل تحسین و تعریف ہو سکتی ہے جو مشین کی طرح مجبوری اور غیر اختیاری شکل سے نہیں بلکہ عین اختیار اور آزادیِ عمل کے وسیلہ سے عمل میں لائی جائے اور یہ بات ممکن ہی نہیں ہے جبتک تعقل و تفکر اور اس کے بعد شعور واحساس کے ثبات و قرار کو اس کی سب سے بڑی بنیاد نہ مانا جائے۔ اس بنا پر ضروری ہوا کہ اعمال و افعال میں ثبات و دوام کا جو اصلی سر چشمہ ہے یعنی فکر و شعور اس میں یہ صفت سب سے پہلے پیدا ہو اور ظاہر ہے کہ جسقدر قوت کے ساتھ شعور و فکر میں ثبات ہوگا اسی طاقت اور شدت کے ساتھ عمل میں بھی اس ثابت قدمی کا عکس اتر آئے گا۔ غرض فلسفۂ اخلاق کی روشنی میں انسانی تمام اعمال کا گہرا رابطہ جس بنیاد اور سر چشمہ سے ہوتا ہے وہ پہلے فکر و شعور ہے، پھر

ارادی عمل ہے اس بنا پر جب بھی ہم ثابت قدمی کی صفت پر بحث کریں گے تو ہمیں لازمی طور پر پہلے فکر اور شعور ہی کی طرف دیکھنا پڑے گا اور اس قوتِ اعتقادی یا طرز ارادی کو جانچنا اور تولنا پڑے گا جو کسی عمل میں انسان کی ثابت قدمی کی بنیاد ہے

قرآنِ حکیم کے سورۂ شوریٰ میں ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (شوریٰ/۱۵)

یعنی اے رسولؐ تم دین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہو اور جیسا تمہیں حکم ہے اسی پر ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا" اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اے رسولؐ صحیح فکر و شعور کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو اور لوگوں کے ضمیر میں ایک غیر متزلزل ایمانی کیفیت پیدا کرو اور دوسروں کے نظریات اور نفسانی خواہشوں سے کبھی متاثر نہ ہونا۔

یعنی ان کی فکر و نظر کے نقوشِ حق کو ان کی لوحِ ضمیر پر اس طرح پر ثبت کر دینا کہ پھر وہ مٹ نہ سکیں۔

اسی طرح سورۂ انفالؔ کی وہ آیت بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ غور طلب ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے۔ وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ،، جنگ بدر کا بیان ہے۔

مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اور نہتی جماعت ہے جسے لشکر کہہ لیجئے اس لئے کہ وہ مشرکین کے ایک بھاری لشکر کے مقابل میدان جنگ میں کھڑی ہے۔ اس مصیبت، دہشت اور بلاخیز ماحول میں اللہ اپنی اُن رحمتوں کا ذکر فرماتا ہے جو اس موقع پر اس نے مسلمانوں اور شمع توحید کے پروانوں پر نازل فرمائیں یعنی آسمان سے پانی کا نزول اور لشکرِ اسلام پر نیند کا غلبہ تاکہ انھیں مادی اور ذہنی ہر طرح کا سکون و اطمینان حاصل ہو سکے اور وہ دشمن سے پورے عزم و ثباتِ قدم کے ساتھ جنگ کر سکیں اور اُن کے دلوں سے ہر قسم کا وسوسۂ باطل دور ہو جائے اور ان میں ایمان و یقین اپنے پورے کمال کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے۔ یہاں بھی پہلے قلوب یعنی ذہن و فکر و شعور کی مضبوطی اور ثبات کا ذکر ہے اور بعد میں علی ثابت قدمی کا بیان ہے۔

اسی طرح سورۂ ہود میں ہے۔ "وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ" [۱۲۰]

اے رسولؐ ہم گذشتہ پیغمبروںؑ کے یہ تمام واقعات تم سے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ اس طرح ہم تمہارے قلب یعنی

روح ونفس کو تقویت دیتے رہیں"۔ یہاں بظاہر تو خطاب اپنے حبیب صلعم خاص کی طرف کیا گیا ہے مگر حقیقت میں مراد وہ صاحبانِ ایمان ہیں جنہیں تقویت روح ونفس اور تسلّی دل تسکینِ ارادہ وفکر کی احتیاج تھی۔ قرآنِ حکیم کا اندازِ کلام بیشتر مقامات پر اسی طرح پر ہے بہر حال یہاں بھی فکر ویقین ہی کی ثابت قدمی پر زور دیا گیا ہے اور اس پوری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سچّا مسلمان اور پکّا مردِ مؤمن وہی ہو سکتا ہے جس کا اللہ اور اس کے دین برحق پر کامل یقین ہو جو غیر متزلزل ہو اور اس میں بھرپور ثبات ودوام موجود ہو اور اسی ایمانی ثبات کے نتیجہ میں اس کے تمام نیک اعمال میں پوری طرح ثابت قدمی کا ظہور ہو اور وہ ہر میدانِ عمل میں اپنے ہر قسم کے دشمن کے مقابلہ میں اپنے زبردست ثباتِ قدم کا مظاہرہ کرے چاہے وہ دشمن مادّی قسم کا ہو یا روحانی نوعیّت کا ہو۔

مکر و فریب

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی زندگی کا تعلق ہر اس چیز سے ہو جاتا ہے جو اس دنیا میں ہے اور اسی تعلق کی بنا پر کچھ حقوق اور فرائض دوسروں کی طرف سے اس کے ذمّہ آجاتے ہیں اور کچھ اُس کی جانب سے دوسروں پر۔ ان تمام ذمّہ داریوں کو پورا کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے اگر وہ صحیح معنی میں انسان ہے اور ان ہی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں انسانی معاشرہ کی زندگی، فلاح اور ترقی موقوف ہے۔ اُس کے گھر والے ہیں، خاندان کے لوگ ہیں، دوست ہیں، محلہ والے، شہر والے اور ملک کے اندر رہنے والے ہیں یا ملک کے باہر کے لوگ ہیں ان سب ہی سے اس کا کوئی نہ کوئی علاقہ ہوتا ہے۔ یہی وہ روابط، رشتے اور تعلقات ہیں جنکی ذمّہ داریوں کو پورا کرنا انسانیت کا امتیاز ہے اور ان ہی ذمّہ داریوں کو پورا کرنے کے لیئے قانون کی ضرورت ہوتی ہے اگر آدمی اپنے ان فرائض اور ذمہ داریوں کو خود ہی ادا کر دیا کرتا تو

کا ہے کو کسی قانون اور شریعت کی حاجت ہوتی مگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اعمال و اقوال اور افکار میں طرح طرح کے جذباتی اور ذاتی دباؤ میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لیئے عقل اس ضرورت کا پوری طرح احساس کرتی ہے کہ ان تمام باتوں کو ایک معتدل راستہ پہ لانے کے لیئے ایسے قوانین اور ایسے ضابطۂ زندگی کی ضرورت ہے جو عدل وانصاف، سچائی اور اعتدال پر قائم ہو اور ایسا قانون صرف وہی ہو سکتا ہے جو الٰہی قانون ہو، غیر اللہ کے بنائے ہوئے تمام قانون اسی طرح ناقص ہوں گے جس طرح اس کے بنانے والے خود ناقص ہوتے ہیں اور خطا اور غلطی سے پاک نہیں ہوتے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی صحیح رہنمائی امن وامان اور خوش حالی اور بہبود کا حقیقی تصور صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ ایسے ضابطۂ حیات پر عمل کیا جائے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا ہو۔

اس الٰہی ضابطۂ زندگی اور قانونِ حیات کی اصلی غرض یہی تو ہوتی ہے کہ انسان اپنے مقام کو سمجھے، اپنی ذمہ داریوں کو خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، پوری طرح محسوس کرے اور ان ذمہ داریوں اور فرائض کو پورا کرے جو بحیثیت انسان کے اس کے لیئے

ثابت اور ضروری ہیں۔ اس قانون کی بنیاد سچائی اور عدل و انصاف پر ہے۔ امن پسندی، انسان دوستی اور فرض شناسی اس کے اعلیٰ ترین مقاصد ہیں اس لیئے مکر و فریب، دھوکا، لوگوں کو اذیت دینا اُن کے حقوق کو برباد کرنا، معاشرہ میں فساد پھیلانا اور اسی طرح کی دوسری انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں اور اخلاقی بیماریوں کی اس قانون کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی، مکر و فریب کا درحقیقت مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اسے دھوکا دیا جائے اور اسے غلط فہمی میں مبتلا کر کے اپنا مطلب حاصل کیا جائے۔ اسکی سیکڑوں صورتیں اور قسمیں ہیں جن میں کچھ ایسی بھی ہیں جو زیادہ چھپی ہوئی نہیں ہوتیں اور تھوڑے غور کے بعد سمجھ میں آجاتی ہیں مگر بعض صورتیں بڑی گہری ہوا کرتی ہیں۔ جنکو آسانی کے ساتھ سمجھ لینا ممکن نہیں ہوتا کبھی یہ مکر و فریب مصنوعی خلوص و محبت کے بھیس میں ہوتا ہے تو کبھی یہ نمائشی عدالت و امانت اور ظاہری تقویٰ اور پرہیزگاری کے لباس میں ہوتا ہے لیکن ان سب ہی صورتوں کی بنیاد منافقت اور خیانت پر ہے، خود غرضی پر ہے اور ظلم پر ہے جو اُس دیانت کی روح کے قطعاً خلاف ہے جو الٰہی قانون اور دینِ حق کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔

مکروفریب سے چند لمحوں کے لیئے کسی فرد کا تھوڑا فائدہ ممکن ہو سکتا ہے لیکن یہ تھوڑا سا فائدہ دوسری طرف اصل انسانی معاشرہ کا عظیم نقصان بھی ہے جس کے اندر خود وہ فرد بھی داخل ہے اس بنا پر نتیجہ میں یہ کسی کا بھی فائدہ نہیں رہتا بلکہ فرد اور معاشرہ دونوں کے لیئے تباہی کا پیغام بن جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مکاریوں کے نتیجہ سے دنیا کو پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔ سورۃ النمل میں ارشاد ہوتا ہے۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ "تم دیکھو ان کے یعنی قوم ثمود کے مکر کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے انہیں اور ان کی ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ فاطر میں ہے: وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ۔

جو لوگ مکاریاں کرتے ہیں اور بری تدبیریں کرتے رہتے ہیں ان کے لیئے سخت عذاب ہے اور ان کی مکاری ملیامیٹ اور برباد ہو جائے گی۔ پھر دوسری جگہ اسی سورۃ میں فرمایا گیا ہے۔ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ۔ "بری تدبیر اور مکروفریب کی برائی تو خود اسی پر پڑتی ہے جو مکاری کرتا ہے"۔ اسی طرح سورۃ نحل میں خدا کا ارشاد ہے اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ

أَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۔" مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مکاریاں کرتے ہیں کیا انھیں اس بات کا خوف بالکل نہیں رہا ہے کہ اللہ اُن کو زمین کے اندر دھنسا دے یا اُس طرف سے ان پر عذاب الٰہی نازل ہو جائے جس کی اُن کو خبر تک نہ ہو یا عذاب خداوندی اُن کو چلتے پھرتے گرفتار کرے تو وہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اُس کے عذاب کا نہ مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی طرح بھی بچ سکتے ہیں۔ یہ اور ان کے علاوہ دوسری آیاتِ کریمہ ہیں جن میں مکروفریب کے بدترین نتیجوں سے قرآنِ کریم نے دنیا والوں کو خبردار کر دیا ہے اور یہ سمجھا دیا ہے کہ مکاری اور دھوکا دینا اتنا بڑا گناہ ہے جس کی سزا قیامت میں تو جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگی لیکن دنیا میں بھی اس کی سزا سے مکر کرنے والے محفوظ نہیں رہتے اور وہ اس طرح عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ انھیں خبر بھی نہیں ہوتی۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ مُسْلِمًا فَلَا يَمْكُرْ وَلَا يَخْدَعْ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ جِبْرَئِيْلَ يَقُوْلُ اِنَّ الْمَكْرَ وَالْخَدِيْعَةَ فِی النَّارِ۔ جو سچا مسلمان ہے وہ کبھی مکر و دغا

اور فریب نہیں کرتا خواہ وہ مکر کسی شکل اور کسی صورت اور کسی لباس میں ہو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیلؑ امین کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ مکرو فریب کا نتیجہ صرف جہنم کی آگ ہے۔

یہ تو تھا مکاری کی بدترین صفت کا وہ رخ جس کا ساری انسانی برادری سے تعلق ہے اور جس میں ایک سچے اور معیاری مسلمان کی شان بتائی گئی ہے کہ وہ کبھی کسی انسان کو خواہ وہ کوئی بھی ہو منشائے الٰہی کے خلاف مکرو دغا اور فریب دینے کا ارادہ نہیں کر سکتا اس کے ساتھ ہی اس بدترین صفت کا وہ رخ بھی بتایا گیا ہے جس کا تعلق مسلمان برادری سے ہے۔ نبی کریمؐ کا فرمان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"جو کسی مسلمان کو دھوکا دے یا اس کی خیانت کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے اور اسی طرح وہ کبھی ہم میں سے نہیں ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے"۔ غرض مکرو فریب، دھوکا اور خیانت جس کی بنیاد ہی اس بدنیتی اور برائی پر ہوتی ہے کہ اپنی ذاتی خواہش پوری کرنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بے ہنری کی حالت میں دوسرے کو گمراہ کیا جائے اور اسے دھوکا دے کر اپنی غرض پوری کی جائے چاہے اسے کتنا

ہی نقصان پہنچ جائے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ایسے مکروفریب کرنے والے نہ صحیح معنی میں مسلمان ہیں اور نہ انسان ہی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ یہ انسانی شکل میں درندے ہوتے ہیں جو ظلم کرتے ہیں اور دوسرے انسانی افراد کی تکلیف اور اذیت میں اپنی راحت محسوس کرتے ہیں۔ مگر ان کو نہیں معلوم کہ ان سے بڑی بھی ایک طاقت ہے جس کی طرف سے ان کے کرتوتوں اور ان کے مکروفریب پر بڑا ہی سخت احتساب اور نگرانی قائم ہے اور اس مکرودغا کی سزا سے وہ آخرت سے پہلے دنیا میں بھی اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک سچے اور پکے مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو فریب دہی کے جذبات سے پاک رکھے اور اپنے تمام کاموں میں سچائی، خلوص، امن دوستی اور مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دے اور اس عظیم فرض کو پورا کرے جو اللہ نے اس کی اپنی ذات اور دوسرے انسانی افراد کی طرف سے اس کے لیئے مقرر فرمایا ہے۔

سیرتِ رسولِ اسلام بحیثیت مدبّر

سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے تدبّر پر بحث کرنے سے پہلے ان حالات اور اس ماحول کو دیکھنا ضروری ہے جس میں آپ نے تبلیغِ رسالت کے کام کا آغاز فرمایا تھا۔ آپ کی حیاتِ پاک کا ایک حصّہ تو وہ تھا جس میں آپ مکّہ میں مقیم تھے اور دوسرا حصّہ وہ تھا جس میں آپ مدینہ میں رہے۔

آغازِ بعثت کے بعد تقریباً ۱۳ برس تک آپ کا قیام مکّہ میں رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت اہلِ مکّہ اور گردوپیش کے سارے ہی قبائل آپ کے سخت مخالف اور دشمن تھے اور آپ کو ہر وقت اپنی جان کا خوف رہتا تھا تمام کفار و مشرکین آپ کو تکلیف پہنچاتے یہاں تک کہ آپ کی جان کے بھی درپے رہا کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ گنتی کے جو چند افراد تھے وہ کسی طرح بھی قریش اور ان کے حلیف قبیلوں کی اجتماعی قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے

نہ اُن کے پاس ضرورت کے مطابق دولت تھی نہ فوج اور اسلحہ ایسے خطرناک ماحول میں آنحضرتؐ کا یہ بے مثال تدبر ہی تھا کہ آپ نے بغیر جنگ کیئے اہل مکّہ اور گرد و نواح کی تمام آبادیوں تک اسلام کی آواز کو پہنچا دیا جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے نامور خاندانوں کے لوگ مسلمان ہو گئے اور یہ سلسلہ سخت ترین رکاوٹوں کے باوجود تیزی سے آگے بڑھنے لگا تھا۔ قریش آپ کو انتہائی سخت اذیتیں پہنچاتے تھے مگر اُن کے لیئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ آپ کے کام کو روک سکیں۔

رسولِ اکرمؐ صبر و تحمّل کے ساتھ تمام تکلیفیں برداشت کرتے رہے اور کبھی ایک لمحہ کے لیئے بھی آپ کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ تکلیفوں اور ایذا رسانیوں سے گھبرا کر کچھ نہ کچھ اقدام کر ہی بیٹھتا مگر آپ نے اپنے دشمنوں کی کسی حرکت کا جواب نہ دیا اور نہ اپنے ساتھیوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ تلوار سے ان کا مقابلہ کریں کیونکہ اس وقت جنگ کرنا مسلمانوں کے لیئے تباہی اور ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ بجائے اس کے آپ نے اس پورے زمانہ میں صرف ذہنی اور اخلاقی جنگ لڑی۔ آپ کے نظریات آپ کے سپاہی تھے اور آپ کا

صبر و تحمل آپ کا اسلحہ تھا جس سے آپ کے دشمن بوکھلا گئے اور انھیں اپنے پیروں کے نیچے سے زمین ہلتے ہوئے نظر آنے لگی اور آخر انھوں نے طے کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی ترکیب سے آپ کو ہلاک کر دیں۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ کی آواز دور دور تک پہنچ چکی تھی اور مدینہ کی ایک بڑی جماعت بھی اسلام قبول کر چکی تھی اور ۱۳ برس کے طویل زمانہ میں مکّہ کے مقامی اور گرد و پیش کے لوگوں نے آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کو بہت قریب سے پوری طرح دیکھ لیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس عظیم مدبّر نے اس کا فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔ شروع میں آپ کے قیامِ مکّہ اور وہاں رہ کر برابر ایذائیں اٹھاتے رہنے کے راز کو شاید کچھ لوگ نہ سمجھے ہوں اور اسے آپ کی بے بسی اور مجبوری کا نتیجہ خیال کرتے ہوں لیکن تاریخی حقائق نے یہ ثابت کر دیا کہ رسولؐ اللہ کا یہ عمل بے بسی اور بے چارگی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ بڑے تدبّر کا نتیجہ تھا کیونکہ ایک طرف تو مکّہ کے مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، اُن کے پاس سامانِ جنگ نہ تھا، اُن میں حربی تنظیم نہ تھی اور ان کا کوئی علیحدہ مرکز نہ تھا، جو دشمن کی سازش سے پوری طرح محفوظ ہوتا اور سب سے

بڑی بات یہ تھی کہ اگر کسی صورت سے بھی جنگ چھڑ جاتی تو پھر آپ کے دشمنوں کو آپ کی سیرت اور کردار کے پرکھنے اور سمجھنے کا موقع نہ مل سکتا۔ اس صبر و تحمل کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ آپ کی تعلیمات پر غور کیا اور غیر محسوس طریقہ پر آپ کی مظلومیت، آپ کے خلق عظیم کی کشش، آپ کے پیغام کی سنجیدگی اور صداقت اُن کے دلوں اور اُن کے شعور احساس کو فتح کرتی رہی اور وہ عداوت و نفرت کی اس آگ کی لپیٹ میں نہ آسکے جو جنگ چھڑ جانے کے بعد متحارب فریق کے دل میں بھڑکنے لگتی ہے اور اس کی ظاہری اور باطنی آنکھوں کو بالکل اندھا کر دیا کرتی ہے۔ اس طرح ۱۳ سال کے مسلسل ضبط و تحمل، نظریات اور سیرت و کردار کی ہم آہنگی، امن پسندی امانت، دیانت، اعلانِ حق میں مثالی جرأت و دلیری اور آپ کے عظیم استقلال اور بے مثال ثابت قدمی نے غیر شعوری طور پر آپ کے دشمنوں کی یک جہتی اور اتحاد میں رخنے ڈال دیئے تھے اور ان کی صفوں میں ابتری پیدا کر دی تھی جس کا پتہ لوگوں کو اس وقت چلا جب ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر تمام قریش نے ایک آواز کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ بڑی

حد تک آپ کے اسی صبر و ضبط کا ردِّ عمل تھا جو آپ نے مکّہ میں رہ کر اور قریش کا ظلم و جور برداشت فرما کر کیا تھا۔

اگر آپ اہل مکّہ سے اُس وقت جنگ شروع کر دیتے، یا وہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جاتے تو اُن کے دلوں پر آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کا وہ نقش قائم نہ ہوتا جو اِس صورت میں ہوا اور یہ سب کچھ آپ کے عظیم تدبر ہی کا نتیجہ تھا۔

مکّہ بلاشبہ عربوں کی تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہ اُمّ القریٰ کہلاتا تھا۔ وہاں مناسک حج ادا کرنے کے لئے عربستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ جمع ہوا کرتے تھے اور اِس اجتماع کی وجہ سے اُن کے دلوں میں جو تأثرات پیدا ہوتے تھے اُن میں ہمہ گیر وسعت پیدا ہو جاتی تھی اور اُن کی تبلیغ عربوں کے ایک ایک گھر میں خود بخود ہو جایا کرتی تھی اس لیئے کافی عرصہ تک آپ کا وہاں قیام بڑا مؤثر ثابت ہوا اور اگرچہ آپ کو بے انتہا زحمتیں اٹھانا پڑیں لیکن آپ کا پیغام عرب ذہن اور فکر پر چھا گیا اور اسلامی تحریک کے لیئے سارے راستے ہموار ہو گئے اِس طرح ۱۳ سال تک سرورِ کائنات مکّہ میں رہ کر پھر مدینہ میں تشریف لائے اور اسے اپنا مرکز بنا لیا۔ طائف اور دوسرے

مقامات کے مقابلہ میں مدینہ کی اہمیت بہت زیادہ تھی اس لیئے کہ یہ مکہ اور شام کے راستہ میں تھا اور اہل مکہ کے تجارتی قافلے اسی راستہ سے شام جایا کرتے تھے۔ چونکہ شام سے تجارتی تعلقات پر مکہ والوں کی اقتصادی خوشحالی کا بہت کچھ انحصار تھا اس لیئے رسول اللہ کا مدینہ کو مرکز بنا لینا ان کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گیا اور ان کے سامنے اس کا حل جنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن اس عظیم مدبر نے دشمن کے فکری اور اجتماعی استحکام کی بنیادیں پہلے ہی کھوکھلی کر دی تھیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کو اب پوری طرح منظم بھی کر لیا تھا جو آپس میں اخوت اور اتحاد واتفاق کے بے پناہ جذبہ سے سرشار تھے اور جس میں سے ہر ایک پیغمبر اسلام کے معمولی سے اشارہ پر اپنا آخری قطرۂ خون بھی بہا دینے کے لیئے تیار رہتا تھا۔

مسلمانوں کے اس مثالی نظم و ضبط کے ساتھ آپ نے مدینہ اور گرد و نواح کے یہودی قبائل کو بھی کافی مراعات دیکر اپنے ساتھ لے لیا یا کم سے کم ان کی مخالفت کے زور کو توڑ دیا۔ مکہ سے لیکر مدینہ تک اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا یہ ابتدائی نقشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا بنایا

ہوا تھا جو وحی و الہام کی روشنی میں آپ کے عظیم تدبّر کا نتیجہ تھا جس کا پہلا ہی ردِّ عمل یہ ہوا کہ ۲ھ میں بدر کے میدان میں چند گنتی کے نہتے مسلمانوں نے قریش کی ٹڈی دل فوج کو ٹھکانے لگا دیا اور انہیں اس طرح شکست دی جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی حالانکہ اس جنگ میں مسلمانوں نے یہودیوں یا کسی دوسری قوم سے کسی قسم کی بھی اقتصادی مالی، فنّی یا کسی اور طرح کی کوئی امداد حاصل نہیں کی تھی بے شک رسول کریم عظیم ترین مدبّر تھے اور آپ کا تدبّر انسانی نسل کے لئے اپنی آپ ہی مثال ہے۔

شجاعت کا فلسفہ

انسان کی اُن اعلیٰ صفتوں میں سے جنکی وجہ سے اُسے کائنات پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے۔ بلند ترین صفت شجاعت ہے۔

شجاعت کے لفظی معنی بہادری کے ہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک بہادری یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت و طاقت کو کمزوروں پر استعمال کیا جائے یا اسے کسی غلط یا نامناسب جگہ پر صرف کیا جائے۔ بہت سے نافہم لوگ اسی بات کو بہادری اور شجاعت سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ اپنی قوّت کا مظاہرہ ہو۔ بات بات پر جھگڑے اور فسادات کئے جائیں، ضعیفوں اور کمزوروں پر قوّت آزمائی ہو اور زبردستی دوسروں سے اپنی بات منوائی جائے۔

حقیقت میں اس کا شجاعت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شجاعت یہ ہے کہ انسان مصیبتوں میں گھر کر اور بڑے سے بڑے خطرہ کے سامنے جاکر بھی اپنے دل اور اپنی عقل پر پورا قابو رکھے اور غصّہ یا خوف میں کوئی ایسی بات نہ کرے

اور کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھے جو دین کے خلاف اور عقل وفہم کے منافی ہو۔ شجاعت، درندگی کا نام نہیں ہے۔ جس طرح ایک پھاڑ کھانے والا جانور عقل نہیں رکھتا اور جس کو پا جاتا ہے اس پر حملہ کر بیٹھتا ہے، جس کو دیکھ لیتا ہے اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا سوائے اس کے کہ وہ اپنی خواہش کو پورا کرے اور اپنی طاقت کو استعمال کرے چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

یہ شجاعت نہیں ہے، اس کا نام بہادری نہیں ہے یہ تو صرف حیوانیت ہے۔

ایسا انسان جو اپنی عقل اور سمجھ سے کام نہ لے اور اپنی قوت وطاقت کو اُن باتوں میں صرف کرے جن میں اُن کو استعمال نہ کرنا چاہیئے، ان جانوروں سے بھی بدتر ہے جن کا کام ہی پھاڑ کھانا ہے۔ کیونکہ وہ عقل وفہم نہیں رکھتے اور انسان کے پاس بہ امتیاز اور حدت موجود ہے پھر بھی وہ عقل سے کام نہ لے تو یقیناً وہ جانوروں سے بھی پست تر ہے، انسان کو اللہ نے برتری عطا فرمائی ہے۔ اس کا مقام اور اس کی عزت بلند ہے اور اسے ساری کائنات پر فضیلت ملی ہے تو کیا

اس لیئے کہ وہ جانور سے بدتر ہو جائے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں اُس سے ظاہر ہونے لگیں جو کسی نافہم اور بے شعور جانور ہی سے ممکن ہو سکتی ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ انسان کی فضیلت اور شرف یہی ہے کہ وہ کسی وقت بھی عقل و ہوش اور فہم و شعور کا دامن نہ چھوڑے اور بڑی سے بڑی آفت و مصیبت کے مقابلہ میں بھی جو کچھ کرے وہ سوچ سمجھ کر۔ دل پر قابو رکھے، دماغی توازن نہ کھوئے۔ استقلال اور ہوشمندی سے کام لے، تحمل و صبر کو فراموش نہ ہونے دے۔ نتائج اور عواقب نگاہ میں رکھے، احکام خدا اور دین و مذہب کی قدریں پیش نظر ہوں، موقع اور محل کو جانتا ہو، دل میں خدا کا خوف اور اس کی عظیم سلطنت و اقتدار پر یقین ہو، غیبی امداد پر بھروسا ہو، ایسا انسان جس میں یہ صفتیں موجود ہوں وہ شجاع اور بہادر ہوگا، بڑی سے بڑی مادّی طاقت اس کے دل میں رعب اور خوف نہیں پیدا کر سکتی اور نہ کسی کی کمزوری اور اس کا ضعف اُسے ظلم و جور اور ایذا رسانی کی طرف دعوت دے سکتا ہے وہ وہی کریگا جو اُس کا احساسِ فرض اُسے بتائے گا اور وہی کہے گا جو عقل و فہم کے نزدیک صحیح اور جائز ہوگا۔

یونیورسٹیوں اور دانشکدوں کی زندگی سے لیکر عوامی گذرگاہوں اور پست ترین اجتماعی و انفرادی حیات کے مرکزوں تک شجاعت کا معیار ایک ہی ہے۔ علمی بحثیں ہوں، مذہبی مناظرے ہوں یا نجی اور ذاتی معاملات ہوں۔ کچھ بھی ہو شجاعت نام ہے تحمّل اور برداشت کے ساتھ اپنی طاقت کے صحیح استعمال کا جسمانی قوت کے جائز صرف کا اور مصائب و آلام اور بڑے سے بڑے خوف و خطر کے وقت پامردی اور استقلال و جرأت کے اعلیٰ ترین مظاہرہ کا جو عقل و احتیاط اور شریعت کے مطابق ہو حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالب کا ارشاد ہے۔

اَشْجَعُ النَّاسِ مَنْ غَلَبَ هَوَاهُ۔

"سب سے زیادہ بہادر انسان وہ ہے جو اپنی خواہشات نفس پر غالب آجائے"

مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات پر آنکھ بند کر کے عمل نہ کرے بلکہ وہی کرے جس کی عقل اجازت دے اور جو خدا کے نزدیک درست و روا ہو۔

شجاعت کی صفت بغیر نفس پر قابو حاصل کئے نہیں حاصل ہو سکتی جس نے اپنے نفس کو قبضہ میں کر لیا وہ بڑا بہادر ہے اور

جو خود ہی اپنے نفس کے قابو میں ہو گیا اور اس کا تابع بن گیا اُس سے بڑھ کر بودا کوئی دوسرا انسان نہیں ہو سکتا۔

اس لیے شجاعت اس کا نام ہے کہ انسان جس طرح اپنی نجی اور عائلی زندگی کے تمام شعبوں میں کسی وقت بھی اپنے توازنِ عقلی کو ہاتھ سے نہ جانے دے اسی طرح اجتماعی حیات کے ہر گوشہ میں اس صفت کو مضبوطی کے ساتھ باقی رکھے عقیدہ اور مذہب کے اظہار کا موقع ہو، سیاسی مقابلے ہوں جسمانی طاقت کے امتحان ہوں، ملکی انتظامات کے مسائل ہوں، قومی اور ملّی امور ہوں آفاتِ ارضی و سماوی کا مقابلہ ہو یا دشمن کی خوفناک فوجوں کا سامنا ہو۔ ہر میدانِ حیات اور ہر شعبۂ زندگی میں شجاعت کا یکساں معیار ہے اور وہ یہی کہ صبر و ضبط اور عقل و ہوش کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور ہمیشہ نفس پر قابو رہے۔ اس دنیا میں کونسا ایسا انسان ہے جسکی زندگی میں اسے مصائب و آلام کا مقابلہ نہ کرنا پڑا ہو۔ یہی مصیبتیں اور آفتیں انسان کی طاقتِ صبر اور صفتِ شجاعت کا مظہر ہوتی ہیں اور ان ہی سے انسان کو آزمایا جاتا ہے۔ بہادر وہ انسان ہے جو اس آزمائش میں پورا اترتا ہے اور بودا وہ ہے جو اس امتحان میں

ناکامیاب ہو جاتا ہے اور زندگی کی ان بلندیوں تک پہنچنے سے محروم ہو جاتا ہے جہاں ایک شجاع اور بہادر کا مقام ہے یقینی کی خواہش تو وقتی طور پر پوری ہی ہو جاتی ہے، دل کی بھڑاس نکل ہی جاتی ہے، انتقام کی آگ بجھ ہی جاتی ہے، ظلم کی پیاس میں سکون حاصل ہو جاتا ہے، حصول اقتدار کی لگن پوری ہو جاتی ہے، جو چاہتا ہے دل وہ سب مل جاتا ہے اور مل سکتا ہے اور نفسِ امّارہ کی ہر ضد پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن نہیں ملتی تو انسانیت کی بلندی اور نہیں حاصل ہوتا تو وہ شرف و عزت اور وہ مقام جو اللہ نے بہادروں اور شجاعوں کے لیئے مقرر فرمایا ہے۔

اللہ کے احکام پر عمل کرنا بہادری ہے۔ مرض ہو، خوف ہو، مصیبتوں کے طوفانی اژدہوں کا سامنا ہو، میدان جنگ ہو یا پھولوں کا بستر ہو، دوستوں کی محفل ہو، یا دشمنوں کا نرغہ ہو خدا کو نہ بھولنا اور اس کے احکام پر سر تسلیم خم کیئے رہنا شجاعت ہے، نیند کا طوفان گھیرے ہوئے ہے نرم بستروں پر کروٹیں لینے کو دل چاہ رہا ہے، مگر آواز اذان کے ساتھ آرام و راحت کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کے لیئے اٹھنا اور اسکی بارگاہ میں سر بسجود ہو جانا یہ بھی شجاعت ہے، اسی طرح جیسے میدان

کارزار میں خدا کے دشمنوں سے جنگ کرنا اور برستی ہوئی آگ میں بے جگری کے ساتھ ٹھہرنا شجاعت ہے۔ مصائب کے طوفانوں کا جو بہادر ہنس ہنس کے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پہاڑ کی طرح جمے ہوئے قدم کسی مصیبت کی ٹکّر سے جنبش نہیں کھاتے۔ شجاعت وہ صفت ہے جسے دشمن بھی عزّت کی نظر سے دیکھتا ہے اور بودا پن وہ مذموم صفت ہے جسے خود دوست بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے شجاعت کی صفت بغیر نفس پر قابو پائے نہیں ملتی، بغیر عقل و ہوش سنبھالے حاصل نہیں ہوتی اور بغیر تحمّل و صبر کے نہیں پائی جاتی اس لئے جو نفس پر غالب نہیں وہ شجاع نہیں، جو عقل کی بات نہ کرے اس میں بہادری نہیں، جو ادائے فرض میں خواہش نفس کو مقدّم کر دے اس میں شجاعت نہیں جس کے پاس تحمّل و صبر کی دولت نہ ہو وہ بہادر نہیں ہو سکتا جس طرح اللہ کے مقرر کیئے ہوئے احکام پر عمل کرنا اور خواہش نفس کے مقابلہ میں اُس کو ترجیح دینا شجاعت ہے اسی طرح حقوق عباد کو پورا کرنا اور اس میں خواہش نفس کی مخالفت کرنا بھی شجاعت و بہادری ہے۔ قوی تر ین انسان کا ایک کمزور فرد کے حق کو مان لینا، بہادری ہے اور اُس کے حقوق کو پامال کرنا

بزدلی ہے۔ ایذا رسانی کا انتقام لینا جائز سہی لیکن معاف کر دینا اور در گذر کرنا بہادری ہے:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (الشوریٰ) "جس نے جرم کو معاف کر دیا اور اصلاح کی اس کی جزا اسے اللہ عطا فرمائے گا۔"

یہی شجاعت و بہادری وہ بلند ترین صفت تھی جس نے مٹھی بھر مسلمانوں کو کرۂ زمین کے ہر حصہ پر پھیلا دیا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی پہلی بڑی لڑائی "بدر" میں اُن کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی جن کے مقابلہ میں دشمن کی بڑی بھاری فوج تھی جو ہر طرح کے سامانِ جنگ سے مسلّح تھی مگر مسلمانوں کی اس بے سروسامان نوج کے پاس جو سب سے بڑا ہتھیار تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے تربیت حاصل کرنے کا شرف تھا اور اسلامی تعلیم کا اسلحہ تھا جس کی مدد سے ان کو فتح حاصل ہوئی اور صرف مکّہ کے چند سردار ہی نہیں اس بہادری کی صفت نے تو ان کے قدموں پر کسریٰ اور خاقان و قیصر کے تاج بھی پھینک دیئے تھے اور مشرق و مغرب میں ان کے اقتدار کے پھریرے اڑنے لگے تھے۔

شجاعت بغیر صبر و تحمّل کے نہیں مل سکتی۔ اسلام نے صبر کرنے کی اس طرح تعلیم دی ہے۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ

اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (لقمان ۱۷)

"جو مصیبت پڑے اُس پر صبر کرو اور بے شک صبر کرنا تو بڑی ہمت کا کام ہے"۔ نفسانی خواہشات پر عمل نہ کرنا بہادری ہے اور اُن کو حکم خدا اور فیصلۂ عقل پر مقدم کر دینا بزدلی ہے۔

جنگ خندق میں شیر خدا حضرت علیؑ ابن ابیطالب کی تلوار مشہور سردار عمرو بن عبدِوُدّ کے سر پہ لگ چکی ہے اور وہ زمین پر تڑپ رہا ہے۔ آپ اس دشمن خدا کے سینہ پر پہنچے اور سر کاٹنا چاہا۔ اسی حالت میں عمرو نے آپ کے چہرۂ مبارک کی طرف تھوک کر بے ادبی کی۔

حضرت امیر المومنین علیؑ فوراً اُس کے سینہ پر سے اُتر آئے اور جب غصہ کم ہوا تو پھر آگے بڑھے اور اس کا سر جدا کیا۔ جب جنگ ختم ہو چکی تو کسی نے سوال کیا کہ آپ نے دشمن کو قابو میں لا کر کیوں چھوڑ دیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ جب اس نے میری طرف تھوکا تھا تو مجھے غصہ آ گیا تھا اُس کی اِس حرکت پر اس لیئے میں اسکے سینہ سے اُتر آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو میری خدمتِ دین میں میرا ذاتی جذبۂ انتقام شریک ہو جائے اور جب وہ غصہ فرو ہو گیا تو میں نے اُس کا سر جدا کر دیا۔ اسلام کی ہمارے لیئے

یہ تعلیم ہے کہ ہم کسی وقت بھی اپنے فرض کے احساس میں نفسانی جذبات کی آمیزش نہ ہونے دیں اور جو کچھ بھی کریں وہی ہو جس کی خدا نے اجازت دی ہے۔

اسلامی تاریخ۔ شجاعت و بہادری کے عظیم کارناموں سے بھری پڑی ہے، ہمارے بہادر اسلاف کے نام انسانی حافظہ سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس سب سے بڑا اسلحہ ہماری تاریخ ہے اور ہمارے بزرگوں کے کارنامے ہیں جو ہماری رگِ حیات میں شجاعت کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے اور اُن میں کبھی نہ مٹنے والی روح بہادری پھونکتے رہیں گے۔ اور یہ وہ تاریخی قدریں ہیں جو ہمارے بچہ بچہ کے ذہن میں ثبت ہیں۔ پاکستان کا وجود بھی اسی جذبۂ خود اعتمادی اور عزم و استقلال و شجاعت کا نتیجہ ہے جس نے کرۂ ارض پر دنیا کی ایک عظیم اسلامی سلطنت کی تخلیق کر دی اور جب تک ملتِ اسلامیہ میں یہ جذبہ باقی رہے گا، دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہماری افواج ساری دنیا میں عظیم امتیاز اور برتری رکھتی ہیں اور اُن میں جو خصوصیات اسلامی نظریۂ شجاعت پر کاربند ہونے کی وجہ سے موجود ہیں وہ تو کرۂ زمین کے کسی لشکر

اورکسی فوج میں نہیں پائی جاتیں اور وہ یہ ہیں کہ وہ اپنی قوت و طاقت کا اندھا دھند استعمال نہیں کرتیں جس میں ظالم و مظلوم کا امتیاز نہ ہو حق و باطل کا تفرقہ نہ ہو اور محل اور موقع شناسی کا دخل باقی نہ رہے۔

کیا اسے تاریخ فراموش کرسکتی ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں جب کبھی کوئی انقلاب آیا تو اس ملک کی سرزمین انسانی خون سے نہلا دی گئی۔ لیکن پاکستان کی سرزمین میں اسی طرح کے انقلابوں کے موقع پر خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پایا اور بغیر کسی تشدد اور خوں ریزی کے ملک کے ہر شعبہ کی اصلاح کردی گئی اور کی جارہی ہے۔ یہی خدا ترسی، خود اعتمادی اور دشواریوں کے مقابلہ میں مستقل مزاجی سے جم جانا اور کسی گھبراہٹ کا اظہار نہ کرنا شجاعت کہلاتا ہے، جو اسلام اور قرآن کی نظر میں بڑا درجہ رکھتی ہے، اسی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو دوام ملتا ہے اور یہی شجاعت پاکستان کے وجود و بقا کی ضامن ہے۔

خودداری

خودداری سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی عزت اور شان کی پوری طرح حفاظت کرے اور کوئی کام ایسا نہ کرے جو اسکی حیثیت اور شان و عزت اور مرتبہ کے منافی ہو۔ مگر یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب وہ عزت اور ذلت کے معیار کو بھی سمجھتا ہو اور ان صفتوں میں تمیز کر سکتا ہو جو اس کے لیئے عزت یا ذلت کا سبب بن سکتی ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ عزت اور ذلت کے معیار کو پہچاننے کے بعد آدمی میں اتنی ہمت اور جرأت بھی موجود ہو کہ وہ نفس کو حقیر و ذلیل بنا دینے والی باتوں کو چھوڑ کر کمالات کو حاصل کر سکے وہ کہ جو اس کی بلندی کے معیار کے مطابق ہوں۔

اگر اس میں اس طرح کی ہمت و جرأت نہ ہوگی تو اس کے لیئے صرف اچھی اور بری صفتوں کی معرفت اور جاننا ہی حصول کمال کے لیئے کافی نہ ہوگا اور وہ ایک کاہل اور بزدل انسان

کی طرح بلندیوں اور شجاعت و بہادری کے فقط خواب ہی دیکھتا رہے گا مگر ان خوابوں کی تعبیر سے محروم رہے گا۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ خودداری کے لیئے انسان کے نفس میں دو بنیادی صفتوں کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ خوددار بن سکے ایک تو عزت و ذلت اور پستی و بلندی کے معیار کی معرفت ہے اور دوسرے تحصیل کمال اور برائیوں سے بچنا اور اس کے معیار کے مطابق جرأت و ہمت کا طبیعت میں پایا جانا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت بلند سوچتے رہتے ہیں لیکن عملی میدان میں ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتے اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بڑا جوش عمل اور ولولہ اور بڑی جرأت و ہمت ہوتی ہے مگر صحیح طریقہ پر کسی بات کو سوچ نہیں سکتے اور اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس لیئے ان دونوں صفتوں کے ایک ساتھ جمع نہ ہونے کی صورت میں انسان کو کامیابی نصیب نہیں ہوتی اور وہ اپنے مرتبہ اور اپنی عزت اور حیثیت کی حفاظت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ خودداری کی بلند صفت حاصل کرنے کیلئے انسان کو ان ہی دو کٹھن راستوں سے گذرنا ہے جن کا ابھی ذکر کیا گیا اگرچہ یہ دونوں ہی باتیں بے حد مشکل ہیں لیکن خصوصیت کے

ساتھ اُن میں سے ایک زیادہ کٹھن اور زیادہ دشوار ہے اور وہ ہے یہ بات کہ انسان اپنے صحیح مقام اور صحیح حیثیت وعزت کو سمجھ لے بھی صاحب عقل وحکمت بزرگ سے پوچھا گیا کہ کونسی چیز سب سے زیادہ مشکل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ: "اَنْ یَّعْرِفَ الْاِنْسَانُ قَدْرَہٗ" یہ بات سب سے زیادہ مشکل ہے

کہ انسان اپنی قدر ومنزلت اور اپنے صحیح مقام اور شرف کو سمجھ لے درحقیقت یہ زندگی کا اس قدر کٹھن، دشوار اور خطرناک رُخ ہے جہاں ذراسی غلطی اور تھوڑی سی بے احتیاطی بھی اُسکو کہیں سے کہیں لیجا سکتی ہے۔ اگر وہ اپنے اصلی مقام کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو اُس کی تعظیم کے لیئے فرشتے بھی جھک جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اگر کوئی اپنے مقام کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھتا ہے تو پھر اُس کی قسمت میں محرومی اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور وہ اپنی سطح اور معیار سے گر کر جانوروں سے بھی نیچے آجاتا ہے اور بالآخر کائنات کے معاشرہ میں اسکی کوئی جگہ نہیں رہتی۔ عزت نفس اور خودداری کے غلط مصرف ہی سے تکبر وغرور کی بدترین صفت کی تخلیق ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اللہ کی مخلوق سے دشمنی اور اُس کی تحقیر کے جذبہ میں بھی جان پڑجاتی ہے اور اُسے ترقی ملتی ہے جس کے نتیجہ میں آدمی اپنے اصلی مقام

کی بلندیوں سے گرنے لگتا ہے اور اس کی ساری فکری صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

خود داری اگر صحیح راستہ پہ ہو تو یہ انسان کے لیئے اس کے مقام و منزلت کے مطابق ہر بلندی اور ہر عزت کی ضمانت ہے۔ بلندی اور وہ عظمت جس کا وہ اس دنیا میں حقدار ہے، اور وہ مقام اور وہ کرامت و شرف بھی جس کا وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں استحقاق رکھتا ہے۔ خودداری کی اعلیٰ صفت انسانیت کے صحیح مقام کی تعمیر کرتی ہے اور انسان کی زندگی کے ہر رخ کو سنوارتی ہے اور جب یہ ایک مرتبہ انسانی طبیعت کا جزو بن جائے اور اس کے مزاج میں گھر کرلے تو پھر اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا ظہور ہوتا رہیگا اور مجموعی طور پر اس کی ساری زندگی ہی کامیاب ہو جائے گی۔ انسان اپنے مقام کو بھولا ہوا تھا وہ کیڑوں مکوڑوں اور کائنات کی معمولی معمولی چیزوں کے سامنے سجدہ کر رہا تھا۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے اس کو اس کے مقام اور اس کی اصلی شان سے آگاہ کر دیا اور بتا دیا کہ خدا نے اسے ساری کائنات سے افضل اور اشرف بنایا ہے اور اسکے لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اس شرف کو سمجھے اور اسکا تحفظ کرے۔ یہی احساس خودداری تھا جس نے مسلمانوں کو

تاریخ کے اُس دور میں سہارا دیا تھا جب وہ انتہائی غربت و افلاس کا شکار تھے، جب اُن کے پاس درہم و دینار، زر و جواہر، مال و دولت اور عیش و عشرت و جاہ و سلطنت کے ڈھیر موجود نہ تھے جب وہ اسلحہ کے عظیم ذخیروں کے مالک نہ تھے اور جب وہ دنیوی اقتدار کے ہر تصوّر سے محروم تھے - صرف ان کا ایمان اور عزمِ محکم اُن کی حوصلہ مندیوں اور ولولوں کی بنیاد تھا اور وہ اللہ کے اس ارشاد پر یقین کامل رکھتے تھے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
(آل عمران ۱۳۹)

اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ رنج کرو - اور تم ہی سب پر غالب رہو گے اگر تم پکے مؤمن ہو۔"

بلاشبہ! ایک مسلمان کی زندگی کا یہ شعار ہے اور اس کی سچائی کی یہ علامت ہے کہ وہ کبھی اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دیتا اور نہ تو وہ خود ایسا کوئی کام کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اُس کے حق میں کوئی ایسی بات کرنے کی جرأت کرے جس سے اِس مسلمان کی عزت وخودداری مجروح ہوتی ہو۔

اسی خودداری اور عزتِ نفس کا سچا احساس دلاتے ہوئے خدا نے فرمایا ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران[۱۱])

(مسلمانو!) تم بہترین اُمّت ہو۔ جو لوگوں کی رہنمائی کے لیئے ظہور میں لائی گئی ہے۔

اسی بلندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (سورۃ منافقون[۸])

ترجمہ:۔ عزّت خدا کے لیئے اور اس کے رسُولؐ کے لیئے ہے اور سچّے ایمان والوں کے لیئے ہے۔

یہی وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلّت جمع نہیں ہوسکتی اور یہی وہ دولت اور خزانہ ہے جس کے بعد مفلسی اور تنگدستی کا تصوّر بھی باقی نہیں رہ سکتا۔

ایک سچّا مسلمان جو اپنی اس انسانی اور ایمانی عزّت کو جانتا ہو جو خدا نے اسے عطا فرمائی ہے وہ ہر حال میں اپنی اس عزّت و وقار کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا۔ وہ کتنا ہی دولتمند ہو جائے اور کیسی ہی بلند دنیوی منزل حاصل کرلے مگر کبھی خدا کے سامنے اور اس کی مخلوق کے مقابلہ میں اپنی حیثیت اور اپنے مقام کو

نہ بھولے گا اور اُن فرائض میں کوتاہی اور کمزوری نہ کرے گا جو خالق و مخلوق کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح ایک سچا ایماندار کتنا ہی فقیر ہو جائے دنیا کا ہر عیش اور ہر راحت اس سے چھن جائے، سارے مادی سہارے ٹوٹ چکے ہوں اور اور نہ فقر و فاقہ میں گھرا ہوا ہو مگر اس کے باوجود وہ کبھی اپنی عزت اور خودداری کو ٹھیس نہ لگنے دے گا، وہ کبھی ذلت و حقارت کے ساتھ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے گا اور وہ کبھی گداگری اور بھیک کی لعنت کو قبول نہ کرے گا کیونکہ اُس کے پاس ایمان و یقین کی کبھی نہ ختم ہونے والی دولت موجود ہے اور وہ اپنی انسانی اور ایمانی بلندیوں سے گر کر کبھی اپنی عزت و آبرو کا سودا نہیں کر سکتا جو بارگاہِ خداوندی سے اسے عطا ہوئی ہے۔

عہد و پیمان

عہد کی پابندی انسانی کردار کا ایک اہم پہلو ہے جس کے بغیر اس کی افادی حیثیت کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ عہد کی خلاف ورزی جہاں ایک شرعی اور دینی گناہ ہے وہاں ایک اخلاقی جرم بھی ہے اور بڑی حد تک معاشرہ کے نظم و ضبط کی خوبیوں کا اسی صفت پر انحصار ہے۔ بالکل صاف بات ہے کہ اگر عہد و قرار کی پابندی ضروری نہ ہو اور ہر شخص عہد کی خلاف ورزی کرنے لگے تو سارا اجتماعی نظم درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور کسی کو کسی پر بھروسا باقی نہ رہیگا اور اس طرح تمام کاروبار اس بے اعتمادی اور بے اعتباری کا شکار ہو کر ختم ہو جائیں گے۔ زندگی کے تمام کام اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب ایک کو دوسرے پر بھروسا ہو اور یہ بات ممکن ہی نہیں ہے جب تک لوگ بات کے پکے اور قول کے دھنی نہ ہوں۔ عہد و پیمان کی پابندی کا ایک لازمی رخ یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں اس میں کوئی خلل پیدا ہو گا تو اس کا نقصان نہ صرف

اس شخص کو ہوگا جس سے عہد کیا گیا ہے بلکہ اس کا قطعی طور پر ردِ عمل بھی ہوگا اور دوسرے بھی خود اس شخص کے عہد و قرار کی پروانہ کریں گے اور اس طرح یہ خود بھی اپنے ذاتی عمل کے نتیجہ کی زد پر آجائے گا۔ اس بنا پر یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ عہد و قرار کی پابندی جسقدر دوسرے لوگوں کی نسبت سے ضروری ہے خود اپنی ذات کے فائدہ کے لیئے بھی لازم ہے اور جس طرح اس کی خلاف ورزی سے دوسرے متاثر ہوتے ہیں ساتھ ہی وہ آدمی بھی اس کے نقصان سے بچ نہیں سکتا جو اس برائی کی ابتدا کرتا ہے مختصر یہ کہ اس بدترین صفت یعنی عہد کی خلاف ورزی میں حکم خداوندی کی مخالفت کے ساتھ دوسرے نقصان ہوتے ہیں۔ جماعتی بھی اور ذاتی بھی اور نتیجہ میں آدمی نہ دنیا کا رہتا ہے نہ آخرت کا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ خود اپنی ذاتِ اقدس کے لیئے فرماتا ہے۔ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ (توبہ ۱۱۱) اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

اور دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (آل عمران ۹) بلا شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

ساتھ ہی اُن لوگوں کی تعریف قرآن کریم میں جا بجا موجود ہے جو وعدہ کا پاس و لحاظ کرتے ہیں اور چاہے کسی حال میں بھی ہوں مگر وہ اس بُرائی کا ارتکاب نہیں کرتے اور خدا اور اس کے بندوں کے سامنے اپنی ذات کو قابل نفرت و حقارت نہیں بننے دیتے۔

ایمان والوں کی اچھی صفتوں کے تذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا (البقرۃ ۱۷۷) یعنی جب وہ لوگ کوئی عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔

اور کسی جگہ صاف طور پر اس کا حکم دے کر عہد کی پابندی کو قانونی حیثیت عطا کر دی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل ۳۴ میں فرمایا گیا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" - عہد کو پورا کیا کرو۔ کیونکہ روزِ حشر اس کے متعلق پوچھ گچھ ہو گی۔ عہد و پیمان کی پابندی کا تعلق بنیادی حیثیت پر جس چیز سے ہے وہ صفتِ امانت ہے کیونکہ بغیر احساسِ امانت عہد و قرار کی پابندی کی اہمیت بھی محسوس نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا عہد و قرار کے پابند وہی لوگ ہوں گے جو امین ہوں گے اور جب کسی کے مزاج میں امانت

کی قدر و قیمت کا پورا شعور موجود ہوگا تو وہ شخص صرف عہد کی پابندی ہی میں نہیں بلکہ ہر اس چیز میں اور ہر اس کام میں اپنی ذمہ داری کے خلاف کبھی کوئی اقدام اور کبھی کوئی عمل خواہ کسی نوعیت یا کسی حیثیت کا ہو نہیں کرے گا، جو امانتداری اور دیانت داری کے منافی ہو۔ اس طرح عہد کی وفا کرنے والوں کو اپنی امانتداری کی صفت کی حفاظت کرنا ضروری ہے اور جس کے کردار میں امانت کی صفت داخل ہو جائے اس کی پوری زندگی اخلاقی حیثیت سے سدھر جانا لازمی ہے اور اس کے برخلاف جس شخص کی طبیعت میں بد عہدی داخل ہو جائے گی وہ یقینی طور پر امانت سے دور اور خیانت سے قریب تر ہو گا جو بنیاد اور سرچشمہ ہے ہر اخلاقی برائی کا۔

عہد و قرار کی پابندی کا تعلق انسانی زندگی کے ہر پہلو سے ہے۔ کسی سے بلا واسطہ اور کسی سے بواسطہ۔ ضروری ہے کہ آدمی اپنے خالق سے جو عہد کرے اس کو پورا کرے اور اسی طرح اس کی مخلوق سے جو عہد و پیمان کرے اُس کی تکمیل کرے یہی ہے ایک سچے مسلمان کی زندگی۔ اس پابندی کا تعلق تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، سیاست و حکومت و تعلیم اور اسی طرح

کے سارے اجتماعی اور انفرادی معاملوں سے ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک تاجر اپنے خریدار سے جو وعدہ کرے اس کو پورا کرے ایک استاد اپنے شاگردوں سے جو عہد کرے اس کو وفا کرے، اور سیاست دانوں کی زبان سے جو وعدے ظاہر ہوں وہ صرف نمائشی نہ ہوں اور وقتی طور پر کام نکالنے اور سادہ لوح لوگوں کو اپنے ساتھ لانے کے لئے نہ ہوں بلکہ ٹھوس ہوں اور حقیقی اور واقعی ہوں۔ حکومت جو کچھ وعدے اپنے محکوموں سے کرے اُن کو بھرپور طریقہ پر انتہائی دیانت و امانت کے ساتھ پورا کرے غرض اسلامی معیاری زندگی یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کا ہر فرد امانت، سچائی اور دیانتداری وفائے عہد و پیماں کی جیتی جاگتی تصویر ہو اور ہر ایک اپنی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داری کا کامل طریقہ پر احساس رکھتا ہو۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور اہلِ بیت اطہار علیہم السلام اور اصحابِ کرام رضوان اللہ علیہم کی سیرتِ پاک ہمارے سامنے ہے۔ اگر ہم سچے مسلمان ہیں اور صدق دل سے ان کے پیرو ہیں تو ہمیں اُن کے احکام اور اُن کی سیرتِ پاک پر عمل کرنا چاہیئے اور پوری شدت کے ساتھ عہد کی پابندی کے اسلامی اصول پر اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہیئے۔

اس کی اہمیت اس بات ہی سے ظاہر ہے کہ حضرت خاتم المرسلین اپنے خطبوں میں عام طور پر یہ فرمایا کرتے تھے: لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَہْدَ لَہٗ۔ اُس آدمی کا کوئی دین ہی نہیں ہے جو عہد و قرار کی وفا نہ کرے۔ دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا ہے: کل روز قیامت تم لوگوں میں سے وہ شخص مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جو سب سے زیادہ عہد و پیمان کی وفا کرتا ہو اور جس کا اخلاق سب سے زیادہ اچھا ہو"۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد کی پابندی کرنا اور وعدہ کا پاس و لحاظ رکھنا اور جس بات کو زبان سے کہہ دیا جائے یا کسی طرح بھی اس کا اقرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا اسلامی شعار ہے اور اسلامی زندگی کا امتیاز ہے اور سچا مسلمان وہی ہے جو عہد و قرار کی پابندی کو اپنے ایمان کی علامت سمجھے اور خالق و مخلوق دونوں ہی کے سامنے اپنی اس بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے میں ذرا سی بھی غفلت نہ کرے۔

حضرت امام جعفرؑ صادق

کفر ثقافتی حملوں کے خلاف حق و دیانت کے فکری محاذ کے عظیم سالار

یہ سنّت الٰہیہ اور طریقۂ خداوندی ہے کہ جب کبھی انسانی افق پر فتنہ و فساد اور باطل پرستی کے بادل چھا جاتے ہیں گمراہی اور ظلم و استبداد کی آندھیاں چلنے لگتی ہیں، بدی نیکیوں کے خلاف صف آرائی شروع کر دیتی ہے اور شعورِ انسانی کی پسپائی کا خوف پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی ہستیاں ظاہر ہوتی رہتی ہیں جو باطل کے تباہ کن طوفانوں کا مقابلہ کر سکیں اور حق و دیانت کے پرچم کو اونچا کریں، دکھی دنیا کی مدد کریں اور گمراہی و باطل نوازی کی تاریکی کو دور کر کے عدل و انصاف اور حقیقت شعاری کے چراغ کی لو تیز تر کر دیں۔ ایسی مصلح ہستیاں ہمیشہ اللہ نے بھیجی ہیں جنہوں نے اپنے روشن کردار، مثالی سیرت اور کوہ شکن عزم و ہمت سے نسل انسانی کی نصرت و حمایت کی ہے۔

حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ بھی اسی طریقۂ الٰہیہ کا ایک عظیم ترین شاہکار تھا۔ اس وقت جب دنیا ظلم وجور اور وحشت وبربریت سے بھر گئی تھی، انسانی شعور اور بشری صلاحیت مفلوج اور بے بس بن چکی تھی، نسلِ آدمؑ حشراتُ الارض سے زیادہ بے حیثیت تھی۔ جب کرۂ زمین کو نا انصافی اور ابلیسیت کی گھنگھور گھٹائیں گھیرے ہوئے تھیں عین اسی وقت مکہ میں اصلاحِ انسانی اور ہدایتِ ربانی کا سورج طالع ہوا، جس نے بشریت کے مزاج میں نئی روح پھونک کر ذہنِ انسانی کو زندگی کے ایک نئے موڑ پر کھڑا کر دیا اور ایک جدید تخیل، نئی فکر، سوچنے اور سمجھنے کا ایک انوکھا طرز اور طریقہ تعلیم دیا۔ وہ انسان جو بے بسی اور غلامی کے گہرے غاروں میں پڑا ہوا سسک رہا تھا اب وہ اپنی قدر وقیمت کو محسوس کرنے لگا، جو پتھر کے حقیر ٹکڑوں اور کم حیثیت جانوروں کے سامنے سجدے کر رہا تھا اس کا سر فخر کے ساتھ اونچا ہو گیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام بھی کچھ ایسے ہی دور میں پیدا ہوئے تھے۔ خدا پرستی اور حق ودیانت کی شمعیں بجھ رہی تھیں اور

اتباع شریعت محمدی کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کے چپہ چپہ پر فتنہ و فساد اور جنگ کے بادل گرج رہے تھے ملوکیت کی قربانگاہ پر دیانت کو بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ انسانی تاریخ کے اس اہم ترین موڑ پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی۔

آپ اسلام کی اُن عظیم ترین اور سرمایۂ فخر و ناز ہستیوں میں ایک ممتاز مقام اور بلند حیثیت کے مالک تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی انسانی فلاح و اصلاح کے پاک مقصد کے لیئے وقف رکھی تھی۔ آپ کی سیرت اسلامی کردار کی روشن تصویر تھی اور آپ ہمیشہ وہی چاہتے اور کرتے تھے جو اسلام کا مقصد تھا اپنی پوری زندگی میں آپ نے ایک لمحہ کے لیئے بھی ان ذمہ داریوں اور تقاضوں سے اپنا قدم نہ ہٹنے دیا جو انفرادی، خاندانی اور عوامی زندگی کی طرف سے آپ کی ذات پر عائد ہو سکتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادق نے اپنے خطبوں، مقالات، ارشادات اور سیرت و عمل سے اسلام کی اُس روح کو اجاگر کر دیا جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا سب سے بڑا مقصد تھا اور اس طرح انسانی شعور و ادراک میں ایک عظیم تر تعمیری انقلاب کا باعث بن گئے۔

آپ نے فکر انسانی کے دھارے کو حقیقت پسندی کی طرف موڑ دیا اور اس کے لیے جدید راہیں پیدا کر دیں۔ آپ کی سیرت پاک کی قدریں ذہن جدید و قدیم کے بہترین تقاضوں اور اقدار کو پورا کرتی ہیں۔ آپکی وسعت علمی، بلندی کردار۔ عبادت و تقویٰ، صبر و استقلال اور حسن اخلاق کی زریں مثالوں نے انسان کے طرز فکر کے لیئے ایک نیا ماحول خلق کر دیا۔ آپکی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ انسانی ضمیر میں خدا کا خوف اسطرح پیدا ہو جائے کہ اسکو کسی بیرونی نگرانی کی ضرورت باقی نہ رہے، اور اس احساس فرض میں خود ہی اتنی قوت آجائے کہ وہ ہوس پرستیوں اور خود غرضانہ جذبات پہ پہرے لگا سکے آپکی کوشش یہ تھی کہ بغیر کسی دنیاوی اور مادی دباؤ اور ظاہری نگرانی کے ہر شخص قانون خداوندی کے احترام کا عادی ہو جائے اور اس میں فرض شناسی کا وہ جذبہ پیدا ہو جائے جو کسی طاقت سے بھی دبایا نہ جا سکے۔

اسلام جس اخوت و یگانگت اور کردار کی برتری کا پیغام لے کر آیا تھا حضرت امام جعفر صادقؑ نے علمی طور پر اسکو خود اپنی سیرت سے اچھی طرح واضح کر دیا اور یہ بتا دیا کہ حقیقی سربلندی اور عزت صرف اسی انسان کا حق ہے جو کردار کے لحاظ سے برتری رکھتا ہو خواہ وہ کسی نسل سے ہو یا کسی خطۂ زمین کا رہنے والا ہو۔ آپ بالکل ایک عام آدمی کی

طرح سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ دھوپ کی شدت میں پسینہ میں شرابور معمولی مزدور کی طرح امامؑ عالی مقام محنت و مزدوری سے آزوقہ حاصل کرنے کو انسانی شرف سمجھتے تھے۔ آپکی صحبت میں ہر قوم اور ہر نسل اور ہر طبقہ کے لوگ ہوتے تھے جو اپنے روحانی رہنما کے ارشادات اور سیرت سے سبق حاصل کرتے تھے۔ آپ کی سیرت کا سب سے بڑا مشن اسلامی کردار کی تعمیر تھا۔ کبھی آپ کو اس بات کی پرواہ نہ ہوئی کہ آپ کے ساتھیوں اور عقیدتمندوں میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی آپکی کوشش ہر تی یہ تھی کہ مسلمان نام کے نہ ہوں بلکہ کام کے ہوں اور صحیح سطح پر اسلام کے فلسفہ کو سمجھیں آپ کے نزدیک دہ چند یا سچے مسلمان جو خدا اور اس کے دین کی اصلی معرفت رکھتے ہوں اُن لاکھوں افراد سے افضل ہیں جنکی زندگی اسلامی شعائر اور انسانی اخلاق کی قدروں کے منافی ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت ۱۷ ربیع الاوّل ۸۳ھ ہجری کو جمعہ کے دن مدینہ میں ہوئی تھی۔ آپ آلِ محمدؐ میں چھٹے امام ہیں اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے، سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کے پردتے اور امام زین العابدین علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ آپ کی والدہ مشہور مفسّر و فقیہہ قاسم بن محمدؒ بن ابی بکر کی بیٹی فاطمہ اُمِ فروہ تھیں۔ آپ کے لقب صادق، صابر، فاضل اور

طاہر تھا اور کنیت ابو اسمٰعیل اور ابو موسیٰ تھی۔ آپ اپنے زمانہ میں اپنے آبائے طاہرین کی سچی تصویر تھے۔ بڑے عابد و زاہد با اخلاق اور علم و فضل کے عظیم ترین مرتبہ پر فائز تھے۔ آپ کی ولادت کے بعد کم از کم بارہ برس اور زیادہ سے زیادہ سولہ ۱۶ سال امام زین العابدین علیہ السلام زندہ رہے۔ دادا کے بعد اُنیس ۱۹ برس تک آپ کے سر پہ امام محمد باقر علیہ السلام کا سایۂ عاطفت باقی رہا اس طرح اسلام اور دیانت کی بہترین پرورش گاہ میں آپ کی ابتدائی تربیت ہوئی امامت و عصمت اور وحی و الہام کے ماحول میں پلتے رہے۔

آپ کی ولادت کے وقت عبدُ الملک بن مَروان کی حکومت تھی جس کے بعد مَروان الحمار تک دس اُموی خلافتوں کے دور آپ کے سامنے گذر گئے۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ ہجری میں اُموی خلافتوں کا دور ختم ہوا اور عبّاسی حکومتوں کا زمانہ شروع ہوا۔ یہی وہ انتقالِ اقتدار کا محدود وقت تھا کہ جب امام جعفر صادق علیہ السلام کو زیادہ موقع ملا کہ وہ علوم و معارفِ اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دے سکیں۔ آپ کی سیرت کے دو رُخ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، ایک آپ کی اسلامی زندگی اور کامل انسانی کردار، دوسرے آپ کی علمی خدمات۔ آپ کی ۶۵ سالہ حیات میں یہ محدود زمانہ جس میں اُموی خلافت کا

دور ختم ہو رہا تھا - اور پھر سلطنت عباسیہ کا آغاز ہو کر ابو العباس سفاح کے بعد ابو جعفر المنصور کا دورِ سلطنت گذر رہا تھا - آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے میں بڑی مدد دے سکتا ہے -

آپ کی عوامی زندگی کا اس طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے، ابو عمر شیبانی کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو اپنے ایک باغ میں دیکھا کہ آپ بیلچہ لیئے ہوئے خود بہ نفس نفیس باغ کی ایک دیوار کو درست کر رہے تھے اور پسینہ بہہ رہا تھا میں نے عرض کی کہ یہ مجھے دیدیجئے اس کام کو میں انجام دیدوں گا آپ زحمت نہ فرمایئں تو امامؑ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات بہت پسند ہے کہ آدمی طلب معیشت کی راہ میں دھوپ کی تمازت کا مزہ چکھے - حسام بن سالم کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کی عادت تھی کہ رات کا کچھ حصہ گذرنے کے بعد روٹیوں اور درہموں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر مدینہ کے حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لیئے نکلتے تھے - اور اُن لوگوں کو اپنے اس محسن کا اُس وقت علم ہوا جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عوام کا صحیح رہنما وہی شخص ہو سکتا ہے جو صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی زندگی کی دشواریوں کا حل

پیش کر سکتا ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام محض زبانی رہنمائی نہیں بلکہ اسلامی سیرت کا عملی نمونہ تھے۔ جس طرح آپ کے ارشادات اور مواعظ و افکار، ہدایت کا سرچشمہ تھے اسی طرح آپ کے اعمال و افعال بھی ایک منارۂ رشد تھے۔

• آپ کی سیرت کا دوسرا اہم رُخ یہ ہے کہ آپ نے علومِ اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں جو حصّہ لیا اور جس طرح اسلام کی ثقافتی سطح پر خدمت کی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے یہ وہ دَور تھا جب فتوحات اور بیرونی دنیا کے اتّصال سے عربستان میں مختلف عُلوم و فنون اور طرح طرح کے نظریات داخل ہو رہے تھے اور اِس طرح اسلام کے خلاف ہر طرف سے ثقافتی یلغار کا سلسلہ جاری تھا اور یہ ایک ایسی جنگ تھی جس کے زہریلے اثرات اور ہلاکت آفریں نتائج سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا تلوار کی دھار اور اسلحہ کی طاقت سے ممکن نہ تھا۔ علم و فکر کا مقابلہ عقل و دانش ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ نسلی تعصّب اور جہالت سے فکری اور عملی طوفان کی ناکہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ یوں تو ائمۂ اطہار نے اسلام کے علمی و ثقافتی محاذ کی ہمیشہ پشت پناہی فرمائی ہے مگر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کام میں جو خصوصیت

حاصل کی وہ تاریخ میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

مدینۂ منوّرہ میں آپ کا گھر اور مسجدِ نبوی ایک بڑے تحقیقاتی اور علمی مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ایک سادہ سی یونیورسٹی تھی۔ جہاں طلبہ زمین اور ٹوٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر علوم و معارف کی تحصیل کیا کرتے تھے۔ اس جامعۂ علمیہ کے چار ہزار طلبہ کے نام آج تک تاریخ کے صفحوں پر محفوظ ہیں۔ اس یونیورسٹی کے سربراہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام تھے۔ مورّخوں کا بیان ہے کہ آپ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیئے علم و تحقیق کے پیاسے انسانوں نے مدینہ کا رخ کیا اور تحصیل معارف کے بعد اس دولت کو لاکھوں انسانوں تک پہنچا دیا اور اس طرح سے اسلامی علوم و فنون کی صدا سے ساری دنیا گونج اٹھی۔

اسلام کے عظیم المرتبت محدّثین فقہاء اور ائمہ حدیث و تفسیر کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ یحییٰ بن سعید انصاری یحییٰ القطّان، شُعبہ، سُفیان بن عُیَینہ، ایوّب سجستانی، سُفیان ثوری، ابن جُریح، مالک ابن انس، ابوحنیفہ جیسے مشاہیر نے آپ سے درس لیا ہے حضرت ابوحنیفہ کا قول مشہور ہے: لولا السنتان

لہلک النعمان" اگر وہ دو سال نہ ہوتے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس گزرے تھے تو نعمان (ابو حنیفہ) ہلاک ہو جاتا۔ تذکرۃ الحفاظ تحفہ اثنا عشریہ ص ۸۵

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں :۔

"علماء نے امام جعفر صادقؑ سے اس قدر علوم حاصل کیئے ہیں جس کی کوئی حد نہیں"

علامہ ذہبی نے حضرت ابو حنیفہؒ کی رائے نقل کی ہے کہ :۔

میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے بڑھ کر علم دین کا عالم کسی کو نہ پایا۔

امام مالکؒ بن انس نے آپ کی علمی فضیلت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے :۔

میری آنکھوں نے علم و فضل و تقویٰ میں حضرت امام جعفر صادقؑ بن محمدؑ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔

علامہ شیخ کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی نے مطالب السئول میں اس کا اقرار اس طرح فرمایا ہے :۔

امام جعفر صادقؑ اہل بیت رسولؐ اور سادات کی عظیم ترین ہستی ہیں۔ آپ مختلف علوم سے معمور تھے اور آپ ہی سے قرآنِ کریم کے معانی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں امام الکیمیا جابر بن حیان کوفی تھے جنہوں نے امام جعفر صادق سے علم کیمیا حاصل کر کے اس فن پر کتابیں لکھیں۔ جنہیں ایشیا اور یورپ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلامک ہسٹری میں ہے:

استاد اعظم جابر بن حیان کوفہ میں پیدا ہوا۔ خیالات میں صوفی تھا اور یمن کا رہنے والا تھا۔ اوائل عمر میں طبیعیات کی تعلیم اچھی طرح حاصل کی اور امام جعفر صادق ابن امام محمد باقر کے فیض صحبت سے خود امام الکیمیا ہو گیا۔ ان ہی جابر بن حیان نے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ جس میں امام جعفر صادق کے پانچ سو رسالوں کو جمع کیا تھا۔ آپ کے شاگردوں کی تصانیف کے علاوہ خود امام کی تصانیف۔ کیمیا، فقہ، حدیث، فلسفہ، طبیعیات، ہیئت، منطق، طب، تشریح الاجسام، افعال الاعضاء، مابعد الطبیعیات وغیرہ پر آپ کی تصانیف کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ آپ کی ایک مشہور کتاب اہلیلجیہ بھی ہے۔ جس میں آپ نے الٰہیات اور مابعد الطبیعیات پر بحث کی ہے۔ اور دہریت و مادیت کے بطلان پر ایسے اصول ذکر کیے ہیں جن کو مانے بغیر کوئی چارہ ممکن نہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے، "ہمیں آئندہ اور گذشتہ کا علم اور ملائکہ کی باتیں سننے کی طاقت دی گئی ہے۔ آپ جفر و جامعہ، جفر احمر و جفر ابیض اور مصحف فاطمہؑ کے بھی مالک تھے۔ مدینہ سے کچھ عرصہ کے لیئے آپ کو خلیفۂ وقت کی جانب سے عراق بلایا گیا تھا۔ اس زمانہ میں مسجد کوفہ آپ کے علمی فیضان کا عظیم مرکز بن گئی تھی جہاں ہزارہا علماء آپ سے درس لینے کے لیئے حاضر رہتے تھے۔

حضرت امام جعفرؑ صادق نے کبھی امارت و ریاست اور حکومت کی خواہش نہ کی بلکہ آپ ہنگامۂ اقتدار سے دور رہ کر ہمیشہ ترویج علوم و معارف اور عبادت الٰہی میں مشغول رہنے کے عادی تھے اور لوگوں کی روحانی اصلاح کرنا اپنا فریضہ زندگی سمجھتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور اسلام کی تاریخ میں علم و ادب کا دور تھا۔ آپ نے علوم کی جو سرپرستی فرمائی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مذہب ہو یا فلسفہ، سائنسی مسائل ہوں یا ملکی قوانین۔ آپ نے ہر شعبۂ زندگی کے لیئے جامع اصول بیان فر

ہیں جو سالکانِ راہ حق اور رہروانِ جادۂ علم و معرفت کے لیئے منارۂ ہدایت ہیں۔

ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے کاموں کی بنیاد کن باتوں پر ہے۔ آپ نے جواب دیا چار چیزوں پر:

پہلے یہ کہ میرا کام کوئی دوسرا نہ کرے گا اس لیئے میں اپنا کام خود کرتا ہوں۔

دوسرے مجھے اس کا علم ہے کہ اللہ میری حالت سے واقف ہے اس لیے حیا اور خوف سے کام لیتا ہوں۔

تیسرے مجھے یقین ہے کہ میرا رزق کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا اس لیئے مجھے اطمینان ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ میرا انجام موت ہے اس لیئے اس کے لیئے آمادہ رہتا ہوں۔

آپ کی احادیث کے متعلق ابوحاتم نے کہا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام ایسے ثقہ اور متقی ہیں کہ آپکی روایت کے متعلق کوئی نقد و جرح نہیں ہو سکتی اور اسی صدق گفتاری اور راست کرداری کی وجہ سے آپ کو صادق کا لقب[1] دیا گیا۔

وفیات الاعیان ابن خلکان میں ہے کہ امام جعفر صادق

[1] صحیح یہ ہے کہ یہ لقب رسول اللہؐ نے دیا تھا۔ رضی

علیہ السلام سادات اہل بیت رسول میں سے تھے صدق گفتار کی وجہ سے ان کا لقب "صادق" ہوا، اُن کا فضل محتاجِ بیان نہیں ہے۔ حِلیۃ الاولیاء میں آپ کے متعلق عمرو بن ابی المقدام سے روایت ہے کہ جب میں حضرت امام جعفر صادق کو دیکھتا تھا تو میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ شخص اولادِ انبیاء سے ہے۔

خلیفہ ابو جعفر منصور نے ایک مرتبہ اپنے وزیر کو حکم دیا کہ امام جعفر صادق کو بلاؤ، میں انھیں قتل کراؤں گا۔ اس نے مجبوراً حکم سلطانی کی تعمیل کی اور فرزند رسول کو دربار منصور میں لایا گیا۔ خلیفہ نے اپنے غلاموں کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ میرے دربار میں آجائیں اور میں اپنے سر سے تاج اتاروں بس اسی وقت تم انھیں قتل کر دینا۔ مگر جیسے ہی امام جعفر صادق علیہ السلام دربار میں پہنچے تو بادشاہ سب کچھ بھول گیا اور بے اختیار اُن کی تعظیم و تکریم کے لیئے کھڑا ہو گیا۔ اور بڑی گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا اور انتہائی ادب کے ساتھ عرض کرنے لگا یا ابن رسول اللہ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور مجھے بجا لانے کا موقع دیجیئے۔ حضرت امام نے فرمایا۔ بس میری خدمت صرف یہ ہے کہ آئندہ مجھے دربار میں آنے کی تکلیف نہ دے۔ منصور نے امام

علیہ السلام کو احترام کے ساتھ رخصت کیا اس وقت وہ خوف سے لرز رہا تھا۔ (شواہد النبوۃ ملا جامی)

امام جعفر صادق کی نصیحتیں بے شمار ہیں جنکو بیان کرنے کے لیئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ نیکی کا کمال یہ ہے کہ اس میں جلدی کرو، اسے کم سمجھو اور چھپا کے کرو۔ توبہ میں تاخیر نفس کا دھوکا ہے، شیطان کے غلبہ سے بچنے کے لیئے لوگوں پر احسان کرو، بخشش سے روکنا خدا سے بدظنی ہے، دنیا میں لوگ باپ اور دادا کے ذریعہ سے متعارف ہوا کرتے ہیں مگر آخرت میں اعمال کے ذریعہ پہچانے جائیں گے، انسان کے بال بچے اس کے اسیر اور قیدی ہیں، نعمت کی وسعت پر انھیں وسعت دینا چاہیئے ورنہ زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے، مؤمن وہ ہے جو غصہ میں راہِ حق سے نہ ہٹے، جو خدا کی نعمت پر قناعت کرے گا وہ مستغنی رہیگا، جو دوسروں کی دولت پر حرص کرے گا وہ ہمیشہ فقیر رہے گا، جو کسی کو بے پردہ کرنے کی سعی کرے گا وہ خود بے پردہ ہو جائے گا، اچھوں سے ملو بروں کے قریب جاؤ کیونکہ وہ ایسے پتھر ہیں جن میں جونک نہیں لگتی، جب روزی ملے تو شکر کرو، جب روزی تنگ ہو تو استغفار کرو تاکہ روزی کے دروازے کھل جائیں۔

علامہ شیخ مفید نے کتاب الارشاد میں تحریر کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی اولاد میں دس لڑکیاں اور لڑکے تھے جن میں سے امام موسیٰؑ کاظم آپ کے جانشین ہوئے آپ کی وفات مدینہ منورہ میں خلیفہ منصور عباسی کے عہد خلافت و سلطنت میں زہر سے واقع ہوئی اور جنت البقیع میں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات پر ابو ہریرۃ العجلی نے ایک دردناک مرثیہ کہا تھا۔ جس میں وہ بیان کرتے ہیں۔ لوگ آپ کے جنازے کو اپنے کاندھوں پر لیئے جا رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا" کیا یہ لوگ جانتے بھی ہیں کہ یہ کسے اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ عرش کا ایک تارا ہے جو زمین کی تاریکیاں دور کرنے کیلئے آ گیا تھا اور اب واپس جا رہا ہے۔ لوگوں نے آپکی قبر میں مٹی ڈالی حالانکہ اچھا ہوتا کہ یہ خاک تمام لوگ اپنے سروں پر ڈالتے اور اپنی بدقسمتی کی وجہ سے اپنی منہ پر طمانچے مارتے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دو شعر بہت مشہور ہیں جنکا ترجمہ یہ ہے۔

وفا اور محبت سے لوگوں کے دل خالی ہو چکے ہیں اور اب وہ انس و محبت کو بھول کر اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی دنیا کیلئے باہمی جنگ و جدال میں مصروف ہیں اور پھر ایک دوسرے سے ملتے ہیں ان کی زبانیں وفا اور محبت کے نغمے بھی سناتی ہیں مگر انکے دل نفرت و عداوت کے بچھوؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔

معراج

عربی زبان میں "معراج" اس آلہ کو کہتے ہیں جسکے ذریعہ سے بلندی اور رفعت حاصل کیجائے۔ اُس مقام کیلئے بھی بولتے ہیں جہاں بلند ہوکر پہنچا جائے اور خود رفعت و بلندی بھی مراد لیتے ہیں لیکن اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد ہے حضور سرور عالم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا عالم مُلکُوت کی سیر کرنا اور انوارِ الٰہی کا مشاہدہ کرنا۔ یہ معراج حضُور کے جسم مبارک کے ساتھ عالم بیداری میں شب کے وقت ہوئی تھی دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو دیکھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، کہ اُولُوالعزم انبیاءؑ کو کسی نہ کسی زمانہ میں اور کسی صورت سے یہ منزلت حاصل ہوئی ہے زمانی و مکانی قیدوں اور رکاوٹوں کو اُن سے دور کر دیا جاتا تھا، کائنات کے مخفی راز اور مُلکُوت ولاہُوت کے اسرار بے نقاب ہو کر اُن کے سامنے لائے جاتے تھے وہ اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق فیضِ ربّانی سے مستفیض ہوتے تھے اور حریمِ قدس میں باریاب ہو کر اس عالمِ آب و گِل میں پھر

واپس آجاتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا تو ارشاد ہوا (انعام ۷۵) وَکَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰہِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیۃ "اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو زمین و آسمان کی سلطنت کا مشاہدہ کراتے ہیں" اسی طرح توراۃ (تکوین ۲۸) میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیرسبع سے نکلنا اور حاران کی طرف جانے کا ذکر موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی اسی طرح کے مشاہدات کا بیان بھی ہے جن کو معراج کے ایک مرتبہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر تجلی حق کا پرتو نظر آیا یہ ان کی معراج تھی۔ انبیاءؑ و مرسلینؑ کے واقعات اس طرح کے حالات اور مشاہدات سے بھرے ہوئے ہیں اور ہر نبیؑ اور رسولؑ نے اپنے رتبہ اور منزلت کی مناسبت سے رموز قدرت اور اسرار کائنات کا مشاہدہ کیا ہے۔ دراصل معراج" انسان کی ارتقائے روحانی اور تقرب الٰہی کا دوسرا نام ہے اسی وجہ سے مؤمن کی نماز کو بھی حدیث میں "معراج" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے "اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ" یہ ارتقائے روحانی تو ہر مقرب بارگاہِ خداوندی اپنے مرتبہ اور مقام کے مطابق ہمیشہ حاصل کرتا رہا ہے لیکن چونکہ حضرت رسالتمآب ﷺ اولین و آخرین میں سب سے افضل تھے اور تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ کے سردار تھے اس لیے حریم قدس اور نرم لاہوتی

ہیں آپ کو وہ مقام عطا ہوا اور وہ مرتبہ ملا جو نہ کسی مَلکِ مقرب
کو مِل سکا اور نہ کسی نبیؑ مرسل کو حاصل ہوا اور آپ اس منزل سے
بھی آگے پہنچے جہاں فرشتۂ وحی حضرت جبرئیلؑ کو یہ الفاظ کہنا پڑے
"لَوْ دَنَوْتُ اَنْمُلَةً لَاحْتَرَقْتُ" اگر میں اس جگہ سے آگے جاؤں گا
تو شدتِ نور اور جلوۂ قُدس کی برقتابیوں اور تابانیوں کو سہار
نہ سکوں گا۔ صحیح و مُستند روایتوں کے مطابق یہ معراج صرف
ایک مرتبہ واقع ہوئی۔ علامہ زُرقانی نے لکھا ہے کہ یہی عام محدثین
اور مفسّرین و متکلّمین کی رائے ہے اور مُستند روایات کا تواتر بھی
یہی بتاتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ "معراج
کا وقت تو خود قرآنِ کریم نے بتا دیا ہے کہ دن نہ تھا بلکہ رات تھی
لیکن تاریخ میں اختلاف ہے اور کسی محدّث نے بھی اس سلسلہ میں
کوئی صحیح روایت نہیں پیش کی ہے مگر اس بات پر سب کا اتفاق
معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعثتِ نبویؐ کے بعد اور ہجرت سے پہلے
ہوئی تھی۔ اسلامی سیرت نگاروں نے اس سلسلہ میں مختلف رائیں
ذکر کی ہیں۔ کسی نے ربیعُ الاوّل کا مہینہ لکھا ہے تو کسی نے ربیعُ الثانی
کا۔ کوئی معراج کو شوّال میں بتاتا ہے کوئی رمضان اور کوئی رجب
کے مہینے میں کہتا ہے۔ علامہ واقدی نے دو روایتیں لکھی ہیں،

ایک میں ۱۷ ر ماہ رمضان اور دوسری میں ۱۷ ر ربیع الاوّل کی تعیین کی ہے مگر ابن قُتَیبہ دِینوری اور ابن عبدُالبَر ماہ رجب کے قائل ہیں نیز علامہ رافعی اور نَوَوی نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ محدّث عبد الغنی قدسی نے بھی یہی کہا ہے اور ساتھ ہی ۲۷ ر ماہ رجب کی تخصیص بھی کی ہے۔ علاّمہ زُرقانی نے لکھا ہے کہ لوگوں کا اسی پر عمل ہے۔

ہجرتِ رسولؐ سے کس قدر قبل معراج واقع ہوئی تھی اس میں بھی محدثین کے مختلف اقوال ہیں لیکن اکثریت اسی طرف ہے کہ یہ ہجرت یعنی ربیعُ الاوّل سلہ سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی علاّمہ بخاری اور علامہ ابن سَعد نے واقعاتِ قبلِ ہجرت کے ذکر میں معراج کے تذکرہ کو سب سے آخر میں لکھا ہے جس سے اس کا ہجرت سے قریب تر ہونا معلوم ہو رہا ہے۔

واقعۂ معراج کو کثیر التعداد راویوں نے بیان کیا ہے علاّمہ زُرقانی نے ۴۵ صحابیوں کا نام لکھا ہے اور اُن تمام کتابوں کے اسماء بھی لکھے ہیں جن میں اُن کی بیان کی ہوئی روایتیں موجود ہیں صحیح بخاری اور صحیح مُسلم میں مستقل طور پر تفصیل کے ساتھ واقعاتِ معراج کا ذکر ہے اور اسے سات اکابر صحابہؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جن میں حضرت ابو ذر غفاریؓ اور حضرت عبد اللہؓ ابن عباس بھی

شامل ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور کے بعد وہ مبارک گھڑی آئی جو اللہ نے اس گُل سرسبد رسالت اور مقصد تکوین عالم حضرت سیدالمرسلینؐ کی سیر ملکوت اور مشاہدۂ عالم قُدس کیلئے معیّن کی تھی۔ فرشتوں کو حکم ملا کہ میرے حبیبؐ خاص کیلئے افلاک کے راستوں کو سجائیں رضوانِ جنت کو ہدایت کی گئی کہ آنے والے کی عظمت کے مطابق خلد بریں کو مزیّن کرے۔ جبرئیلؑ امین کو اشارۂ قدرت ہوا کہ محبوبؐ کبریا کیلئے وہ سواری لیجائیں جو برق سے زیادہ تیز رفتار اور شعاع مہر سے زیادہ سُبک خرام ہو اور جو اس مسافر منزل لاہوت اور رہ نورد خطۂ نور کے لائق ہو جو عالمِ تکوین سے حریم قُدس کی طرف بلایا جا رہا تھا عالمِ آب و خاک کی بندشیں ٹوٹنے لگیں، آتش و ہوا کی فطرتیں معطل ہونے لگیں، عناصر کی طبیعتیں بدلنے لگیں، فضا نے راستہ دیا۔ افلاک نے اپنے دروازے کھول کے ادب سے راہ دی، فضاؤں نے سواری نور کو دوش پہ اٹھایا، زمان و مکان کے حدود نے اس مسافر لاہوتی کے استقبال میں آنکھیں فرش راہ کر دیں۔

اُدھر وحی الٰہی کی صدا سے سارا خطۂ لاہوتی گونجنے لگا:

"سُبحانَ الّذی اَسریٰ بعَبدِہٖ لیلاً مّنَ المَسجِدِ الحَرامِ اِلی المَسجِدِ الاَقصا الّذی بارَکنا حَولَہٗ لِنُرِیَہٗ مِن اٰیٰتِنا"

(اسرآء/۱) وہ اللہ ہر عیب سے پاک و پاکیزہ ہے جس نے اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی جس کے گرد ہم نے ہر قسم کی برکت مہیا کر رکھی ہے تاکہ اپنے اس عبد خاص کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں"۔ بعض مفسرین نے مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس کو مراد لیا ہے۔ مگر تفسیر آل محمدؐ کے مطابق اس سے مراد وہ آسمانی مسجد ہے جو خانۂ کعبہ کے مقابل فلکِ چہارم پر ہے۔

ظاہری حیثیت سے یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ایک مادّی جسم چشم زدن میں آسمانوں میں چلا جائے اور کائنات عالمِ ملکوت و لاہوت کی سیر کر کے پھر واپس آجائے اور اسی وجہ سے بہت سے لوگوں نے معراج جسمانی سے انکار کر دیا ہے اِسلیئے کہ اُنکی نگاہیں اور انکے طائر فکر کی پرواز محدود تھی۔ قرآن ہی حدود میں جو اُن کے ادراک اور شعور کے دائرۂ اقتدار کے اندر تھے۔ سوال بس اتنا سی تو ہے کہ تھوڑی سی دیر میں اس قدر لمبی مسافت کیونکر طے ہو گئی، کرۂ آتش و زمہریر سے کیونکر گذرے اور پھر جب جدید سائنس نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آسمانوں کا وجود ہی نہیں ہے تو ایک آسمان سے دوسرا اور تیسرے چوتھے اور پھر اسکے بعد آسمانوں تک اُس

شان سے تشریف لیجانا جس کا روایات میں ذکر ہے کیوں کر ممکن ہے۔ آسمانوں کے قائل ہر اُلٹے ہیئت دالوں نے بھی خرق والتیام کی گتھیاں پیدا کر دیں۔ جذبِ مرکزی اور دوسری بحثیں شروع ہو گئیں مگر یہ کسی نے نہ دیکھا کہ معراج کی خبر کس نے بیان کی ہے، اور کس نے اس تفصیل کو ہم تک پہنچایا ہے۔ یہ واقعہ تو خود اس پیغمبرؐ صادق نے بیان کیا تھا جس کی امانت اور سچائی پر کبھی کسی کو شک و شبہ نہ پیدا ہو سکا۔ اس کے بعد سیکڑوں اکابر صحابہؓ و تابعینؒ نے اس واقعہ کی روایت کی اور کبھی اس میں شک و شبہ ظاہر نہ کیا اور نہ کبھی کسی طرح کے استبعادِ عقلی کو دخل دیا گیا آخر یہ لوگ بھی تو عقل نہ رکھنے والے تھے۔ غلط اور صحیح کو پرکھنے والے اور مبالغہ و حقیقت میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر قرآنِ کریم صاف طور سے معراج کی خبر کا اعلان کر رہا ہے۔ جہاں تک خرق والتیام کی بحث کا تعلق ہے اسکا جواب صرف یہ ہے کہ اگر ایک حرکت دوسری حرکت سے تیز تر ہو تو کم حرکت تیز حرکت کے مقابلہ میں سکون سے بدل جاتی ہے۔ نبیؐ کریم جس تیز رفتاری سے معراج میں تشریف لے گئے تھے اس کے مقابلہ میں حرکتِ فلکی کی کوئی حیثیت نہ تھی اس لیئے یہاں خرق والتیام کی بحث کی گنجائش ہی ممکن نہیں ہے۔ اگر آسمان سے مراد صرف

بلندی ہے تو بلندیوں کی بھی قسمیں ممکن ہیں جن کو مختلف آسمانوں کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ آسمان کو نیلگوں خلاء کہنے والوں نے آج تک یہ ثابت نہ کیا کہ اس خلاء کے بعد کیا چیز ہے، اور اس وقت تک آسمانوں کے موجود نہ ہونے پر کوئی حسّی یا عقلی دلیل نہ پیش کر سکے۔ سائنسی رسدگاہیں سیکڑوں سال سے مختلف مشاہدات اور نظریات پیش کرتی رہتی ہیں۔ کبھی کچھ نظر آتا ہے تو کبھی کچھ اور اگر آج ایک تحقیق سامنے آتی ہے تو کل وہ باطل ہو کر دوسری تحقیق پیش کی جاتی ہے۔

مگر قرآن اور احادیث نے جو پہلے کہا تھا وہ اب بھی اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ دنیا والوں کے نظریات موسمی ہواؤں کی طرح بدلتے رہتے ہیں مگر درسگاہِ الوہیت سے پڑھ کر آنے والوں کی باتوں میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ خلاء میں جانے والوں کو کششِ ارضی کے حدود کے بعد جس ایتھری فضاء کا مشاہدہ ہوا ہے اُس کا اس سے پہلے اُنھیں کوئی علم تھا۔

بڑی تحقیق اور عرق ریزی کے بعد ہمیں کچھ ایٹمی ذرّات مل سکے جن سے تیز رفتار راکٹ بنا کر ہم نے سرعتِ رفتار کے حیرت انگیز ریکارڈ قائم کئے اور چند سکنڈ میں ہزار ہا میل کی مسافت طے کرنے

والے آلات ایجاد کر لیئے۔

یہ تمام ذرّات اور ایٹم اسی ہماری زمین کے لا متناہی خزانوں کا عطیہ ہیں جو انسانوں کو تحقیق و تفتیش بسیار کے بعد مل سکے ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زمین کے اندر بس اتنی ہی چیزیں ہیں یہ مخفیں اور اب اُن سے زیادہ طاقتور اور سرعتِ سیر کو بڑھانے والی کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔ انسان کا علم جسقدر بڑھتا جائے گا اس کو کائنات کے رازوں کی معرفت ہوتی جائیگی۔

انبیاءؑ و مرسلینؑ کی معرفت اور تاثیری طاقتوں کے سامنے ہمارے علم و تحقیق کی کیا وقعت و حیثیت ہے۔ جس قادرِ مطلق نے بے جان ایٹمی ذرّات میں اسقدر طاقت بخشی ہے کیا وہ سردارِ مرسلینؐ ، نورِ یزدانی، مقصدِ تخلیق و تکوینِ عالم اور اپنے حبیبِ خاص کو سرعتِ سیر کا معجزہ نہیں دے سکتا! پھر آج تک محققین اور فلسفہ دانوں نے سرعتِ سیر کی کوئی حد بندی بھی نہیں کی ہے کیا ایک سو سال قبل راکٹ کی موجودہ رفتار کا کسی انسان کو تصور بھی ممکن ہو سکتا تھا ؟ تو بس اسی طرح کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے راکٹ اور ایسے آلات ایجاد کر لیئے جائیں جن کی سرعتِ سیر کے مقابلہ میں موجودہ

سرعتِ رفتار کی کوئی بھی حقیقت و اصلیت اور کسی قسم کا تقابل باقی نہ رہے۔ روشنی کی رفتار، آواز کی سرعتِ سیر، سیاروں کی تیز حرکت اور سب سے زیادہ خود ہر انسان کے نورِ نگاہ کی تیزیٔ رفتار کی کوئی انتہا ہے! اِدھر آنکھ کھلی اور مسافرِ نور کے سامنے سے حجاب اٹھا کہ ایک لمحہ میں اُس کے قدم کروڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے زُہرہ، عُطارِد، زُحل و مریخ سے بھی بہت دور ستاروں تک پہنچنے لگے اور آنکھ کی ننھی سی پتلی میں وسیع کائنات سمانے لگی۔ یہ سب کارسازِ قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں جو ہر چشمِ بصیرت رکھنے والے انسان کے لیئے عبرت کا مجسمہ ہیں۔

ان تمام آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد اور مخلوقاتِ عالم کی معمولی اور بے بساط چیزوں کی تاثیر اور شدتِ رفتار دیکھنے کے بعد الٰہی قدرت اور خالقِ عالم کے لامحدود اقتدار پہ تھوڑا سا غور کرنیوالا کبھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ معراج کا واقعہ اس لئے درست نہیں ہے کہ اسکا وقوع نظامِ فطرتِ عالم کے خلاف ہے۔ آنحضرتؐ کے اشاروں سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، ہاتھوں پر آکے سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا، دھوپ میں سرِ اقدس پہ بادلوں کا سایہ کرنا، روشنی میں جسمِ مبارک کا سایہ ظاہر نہ ہوتا، پتھر پہ

نشانِ قدم کا ابھرنا اور زمین نرم پر پیروں کے نشانات پیدا نہ ہونا
مغرب میں ڈوبے ہوئے سورج کا پلٹ آنا اور اسی طرح کے ہزاروں
معجزے تھے جو اللہ نے اس روحِ ملکوتی اور آئینۂ نورِ ربانی کو
عطا کئے تھے۔ معراج بھی ان ہی معجزات میں سے ایک عظیم معجزہ
تھا جو آپ کی نبوت و رسالت پر قیامت تک شاہد رہے گا۔

اللہ کو معلوم تھا کہ انسان سرعت میں بڑھانے اور فضاؤں پر
قابو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیئے اُس نے اپنے آخری
نبیؐ کو ایک ایسا معجزۂ سرعتِ رفتار دیدیا اور فضائے کائنات اور
خلاء کی لامحدود وسعتوں پر ایسا قابو عطا کردیا جو قیامت تک انسانی
عقل اور فکرِ بشری کی پرواز کے لیئے معجزہ بنا رہے گا۔ قرآنِ کریم
کا اعلان برحق ہے تو معراج کا واقعہ بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے
پیغمبرؐ مدنی امین اور صادق القول تھے تو آپؐ کا بیان بھی یقیناً صحیح و
درست ہے۔ اجلۂ صحابہؓ اور اکابر تابعینؒ نیز اسلامی مکتبۂ فکر و
تحقیق کی عظیم ترین شخصیتوں نے اس واقعہ کو سن کر ہمیشہ سرِ تسلیم
خم رکھا اور معراج کے اعتقاد کو اپنے ایمان کا جزو سمجھا۔ یہ لوگ عہدِ
رسالت سے متصل یا قریب تر تھے اور یہ یونانی اور دوسرے خطہائے
زمین کے تمام نظریات و رجحاناتِ فکری سے پوری طرح واقف

تھے مگر کبھی انہیں اس میں شک نہ ہوا۔ حضرت خاتم الانبیاء کی خلقت اللہ نے نورِ خاص سے فرمائی تھی، وہ مقصودِ کائنات تھے اسی نور کی شعاعوں سے انبیاء و مرسلین کی تخلیق ہوئی اسی نور کی چھوٹ سے ستاروں میں روشنی آئی، اور اسی نور ازلی کے عکس سے کائنات کے بے جان ذروں میں زندگی کی اُمنگیں اُبھرنے لگیں۔ کائنات کی کونسی مخلوق ہے جو اس نور کے صدقہ میں نہ بنی ہو تو جب کرنوں میں اتنی طاقت اور سرعتِ سیر ہے تو خود چشمۂ نور کی طاقت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جب عکس میں یہ جذب و کشش ہے تو خود اس شاہدِ نور کے کمال و اقتدار کی کیا حد ہوگی اور جب پیدا ہونے والی مخلوقات میں یہ تاثیریں ہیں تو جو مقصدِ تکوینِ عالم ہو اور واسطۂ ایجاد کائنات اور وسیلۂ خلقت ارض و سماء ہو اس کی تاثیر اور تسخیری طاقتوں کے حدود کا کون اندازہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

مردِ مجاہد

اسلام امن کا علمبردار ہے - اس کا سب سے بڑا مقصد دنیا میں امن وسلامتی کا قیام ہے، وہ قتل و خونریزی کا سخت ترین دشمن ہے لیکن ہر ذی شعور آدمی جانتا ہے کہ امن و امان قائم کرنے کے لیئے کبھی خونریزی بھی کرنا پڑتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی پھوڑے کی اصلاح کے لیئے اس کا آپریشن ضروری ہوتا ہے، اسے کاٹنا پڑتا ہے اور اس کے فاسد خون کو نکالنا پڑتا ہے۔ یہی حالت انسانی معاشرے کی بھی ہے۔ یوں تو ایک سچے مسلمان کی ساری زندگی ہی جہادِ راہِ خدا ہے لیکن تلوار سے جہاد کرنے کا حکم اسی نظریہ کے تحت دیا گیا ہے کہ جب اصلاح کے تمام طریقے مسدود ہو جائیں تو پھر تلوار اٹھاؤ اور حق و صداقت کی قدروں کی سالمیت کے لیئے انسانی معاشرے کے زہریلے پھوڑوں کو کاٹ کر فساد کے تمام جراثیم کو فنا کر دو۔ اللہ ضرور تمام عالمین کا رب اور پروردگار ہے لیکن جب شیطانی قوتیں الہٰی قانون کی خلاف ورزی کرتی ہیں تو اللہ کی پروردگاری اور الوہیت محض برائی کی اصلاح کے لیئے

مُفسد قوموں پر عذاب نازل کرتی ہے اور اسی الوہیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ فساد کو دور کرنے کے لیئے کافروں اور مُفسِدوں پر قہر بنکر ٹوٹ پڑے۔ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بلاشبہ رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن تھے۔ یعنی تمام کائنات کے لیئے رحمت تھے۔ لیکن یہ بات بھی رحمت وشفقت کے عین مطابق تھی کہ انسانیت کو کفر و شرک کے خونخوار پنجوں سے بچانے کے لیئے اور اُس کے خون آشام جبڑوں سے چھٹکارا دلانے کے لیئے باطل کی طاقتوں کو پوری طرح کچل دیا جائے۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی رحمت وشفقت اور نصرت وحمایت صرف اُس کے لیئے ہے جو اس کا مستحق ہو اور جو اس کا استحقاق نہ رکھتا ہو اُس کے حق میں یہ رحمت، شدّت اور عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر دنیا عاد وثمود اور اصحابِ فرعون کی تباہی اور اُن کے پُرغرور قلعۂ اقتدار کی بربادی کے مناظر دیکھتی رہی ہے۔ یہ سب کچھ رحیم ورحمان اللہ کی طرف سے صرف انسانیت کی بہبود اور کائنات کے اَمن وسلامتی کے لیئے ہوتا ہے اور اس لیئے ہوتا ہے کہ باطل کی شیطانی قوتیں دینِ خداوندی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ جہاد کا مقصد بھی وہی ہے جو عذابِ خداوندی کا مقصد ہے مگر عذاب نازل کرنا خدا سے متعلق ہے اور جہاد کرنا اہلِ حق کا کام ہے۔ اِسی بناپر اسلامی

جہاد کو محض ایک آویزش اور ایک لڑائی سمجھ لینا انتہائی غلطی ہے۔ بلکہ یہ جہاد اسی طرح اللہ کی عبادت ہے جس طرح نماز روزہ اور حج عبادت ہے۔ جہاد کرنے والوں کی منزلت خدا کے نزدیک جو کچھ ہے وہ ان آیات قرآنی سے ظاہر ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ط (توبہ/ ۱۱۱)

اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں اور اموال کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ انھیں جنت عطا کی جائے گی۔

پھر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۹ - ۱۷۱)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِہِمْ مِّنْ خَلْفِہِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ہ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں۔ انھیں ہرگز مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں رزق پاتے رہتے ہیں۔ اُن نعمتوں پر خوش ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور جو لوگ آج تک اُن سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں

اُن کی بھی اِس حالت سے خوش ہیں کہ اُن کے لیئے نہ کوئی خوف ہے، اور نہ کوئی غم ہے، وہ لوگ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے اِنعام اور فضل پر اور اِس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہے:-

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ (سورۂ نسآء ۷۴)

جو شخص خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے پھر وہ قتل ہو جاتا ہے یا غالب ہو جاتا ہے۔ ہر صورت میں ہم اس کو بڑا اجر و ثواب عنایت کریں گے۔"

جہادِ راہِ خدا اور شہادت مردِ مُسلم کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ، جنت تلواروں کی چھاؤں میں ملتی ہے"۔ فاتحِ خندق و خیبر حضرت حیدر کرار علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جہاد جنت کا دروازہ ہے"، شہیدِ کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کی آواز آج تک دنیا کے کانوں میں گونج رہی ہے:-

اَلْمَوْتُ اَوْلٰى مِنْ رُكُوْبِ الْعَارِ۔ "خدا کی راہ میں مر جانا ننگ و عار کی زندگی سے ہر طرح افضل ہے۔ اس وقت السلام دشمن طاقتوں

کے جارحانہ فکری اور مادی حملوں سے پورے عالم اسلام کے وجود اور سالمیّت کو شدید خطرہ ہے اس لیئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے خون سے، اپنے مال سے، دولت سے اور تمام وسائل سے حفاظتِ اسلام کے فریضہ میں حصّہ لے اور دشمنوں کے غرور و نخوت کو پاش پاش کر دے اور اُس کے وحشیانہ حملوں کے سامنے پوری ملّتِ اسلامیہ ایک ناقابلِ تسخیر لوہے کی دیوار بن جائے۔ اس مدافعت میں امداد کرنا اور حصّہ لینا ہر مسلمان کے لیئے ہر اُس صورت سے واجب ہے جو اُس کے لیئے ممکن ہو اور جس طرح سے بھی وہ اس جہاد میں حصّہ لے سکے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں بھرپور استقامت کی قوّت اُجاگر ہو اور آپس کے زبردست تعاون اور یکجہتی کیساتھ پوری ملّتِ مُسلمہ ایک ناقابل تسخیر چٹان بن جائے۔ ہماری تاریخ، استقلال و جرأت کی تاریخ ہے۔ ہم نے ہمیشہ دشمنوں کے ٹڈی دل لشکروں پر اپنے ایمان و یقین، صبر و استقامت اور نصرت خداوندی کے ذریعہ سے فتح حاصل کی ہے اور آج بھی ہمیں اپنے اسی تاریخی کردار کو پیش کرنا ہے۔

اسلامی تعلیمات اور فطرت

فطرت کے معنی پیدائش کے ہیں۔ جس طرح دنیا کی ہر چیز ایک خاص طریقہ پر پیدا کی گئی ہے انسان بھی اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے جسم کی ساخت اور بناوٹ دوسرے جانداروں سے امتیاز رکھتی ہے۔ اُسکی خواہشات، اُس کی زندگی کے طور طریقے، اُس کی معاشرت، اُسکی عقل و فراست اور اُس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظم و نسق ایک خاص انداز پر ہے اور اس کے لئے بنیادی طور پر جو فطرت کے اصول مقرر ہیں اُن میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جو پیدائش کا طریقہ معین ہے اس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح موت کو نہیں روکا جا سکتا۔ جو خلقی صلاحیتیں انسان میں موجود ہیں یا جو اُس کے بدن میں فطری کیفیات ہیں اُن میں اس طرح تبدیلی نہیں کی جا سکتی کہ وہ بنیادی طور پر کچھ اور ہو جائیں۔ دین و مذہب کا

مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی زندگی کو مادّی اور روحانی حیثیتوں سے فطرت کے اُن بنیادی اصول اور اَقدار کے مطابق بنادے جن پر اُس کی پیدائش ہوئی ہے - اس کائنات کی ہر چیز کے وجود کا ایک خاص مقصد ہے اور ہر شئے ایک مخصوص غرض کے لئے بنائی گئی ہے اصولی طور پر جو چیز جس مقصد کے لیئے وجود میں آئے اُس کو اُس چیز سے پورا ہونا چاہیئے ورنہ اُس کی پیدائش کا کوئی فائدہ نہ ہوگا - ظاہر ہے کہ اللہ نے کائناتِ عالَم کی کسی چیز کو بیکار نہیں خلق فرمایا - روشنی، تاریکی، دن، رات، چاند ستارے ہَوا، آگ، پانی، مٹی، درخت، پھل، پھول غرض اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ یقیناً کسی خاص مقصد کیلیئے ہے اور اُس کی تخلیق عَبَث اور بیکار نہیں کی گئی - انسان بھی اس سلسلۂ کائنات کی ایک اہم کڑی ہے، اُس کو حُسن و جمال ملا ہے اُسے عقل وادراک عطا ہوا ہے، اس کو طاقت و قوّت بخشی گئی ہے، اُس کے جسم میں وہ تمام طاقتیں اور صلاحیتیں بخشی گئی ہیں جو اُس کے لیئے اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیئے ضروری تھیں لیکن اِن فطری طاقتوں اور صلاحیتوں کا فائدہ اُسی وقت حاصل ہوسکتا ہے - جب انہیں اُن کے صحیح اور اصلی اغراض و مقاصد میں صرف کیا جائے اور اُن سے

وہ کام لیا جائے جس کے لیئے انھیں بنایا گیا ہے۔ دین کی اصلی غرض صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ انسان کو زندگی کا ایسا طریقہ بنا دے جو اُس کی فطرت کے مطابق ہو۔

دنیا کے ہر مذہب نے یہی دعوٰی کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے جسے وہ انسان کی نجات کہتا ہے۔ اسلام نے بھی یہی کہا تھا: فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ (الروم/۳۰)

"تم باطل سے کترا کے اپنا رخ دین کی طرف کیئے رہو۔ یہی اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت (اور فطرت) میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ یہی مضبوط اور سیدھا دین ہے۔ مگر بہت سے لوگ نہیں جانتے۔"

تفصیلی جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب نے اپنی تعلیموں اور احکام میں انسانی فطری رجحانات اور فطری ضروریات کا لحاظ نہیں رکھا۔ انسان فطری طور پر اجتماعی زندگی کا طلبگار تھا مگر اس کے برخلاف بہت سے مذہبوں نے اسے ترک دنیا کی تعلیم دے کر رہبانیت کی طرف مائل کرنے

کی کوشش کی جو اُس کی فطرت کے بالکل خلاف تھا۔ اُس کی فطرت ازدواجی حیات چاہتی تھی، کسی مذہب نے آسے اس کے خلاف تعلیم دی، کسی نے اسے ستی ہونے اور زندہ آگ میں جل جانے کی تعلیم دی، کسی نے لڑکیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دینا ہی انسانیت کی نجات کا باعث خیال کیا تو کسی مذہب نے عورت اور زمین میں کسی کا کوئی خصوصی حق نہ رکھا بلکہ اُن میں بلا قید و شرط ہر انسان کا حق تسلیم کر لیا اور اُن کو سب کے لیے عام کر دیا اور پھر کسی کو دوسرے شخص کے روکنے اور منع کرنے کا اختیار اور حق باقی نہ رہا۔

کسی نے اس کے بالکل خلاف انسانی افرادیہ قید و بند کی حدیں سخت کر دیں، اور ایسی ایسی سخت ریاضتیں اور ایسے مشکل اور دشوار احکام دیئے جو انسانی قوّتِ برداشت سے باہر تھے۔ مگر اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اُس کو ایسی ہدایتیں اور ایسی تعلیمیں دیں جو اُس کی فطرت کے عین مطابق تھیں، جو اُس کی تکمیل کا باعث اور اس کی بہتری کی بنیاد تھیں۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (البقرۃ ۲۸۶) میں قرآن کریم کا اعلان ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ اللہ کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، اس لیے

جس قدر بھی اسلامی تعلیمات اور احکام ہیں وہ سب انسان کی فطری قوتوں اور اُس کے حالات اور ماحول کے مطابق ہیں یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اُن تعلیمات پر عمل نہ کرے اور اُن سے فائدہ نہ اٹھائے، اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں بلکہ خود اُس انسان کا قصور ہے جو اسکی ہدایت سے فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ انسان کی پہلی بنیادی تعلیم اللہ کے وجود کا اقرار ہے اس لئے کہ انسان اور کائنات کی ہر چیز کی خلقت اور فطرت بتاتی ہے کہ اُس کا کوئی نہ کوئی خلق کرنے والا ہے جس کی مشیت اور ارادہ کے بغیر اُس کی خلقت ممکن نہ تھی۔ انسانی فطرت کا سب سے پہلا تقاضا اور اُس کی بناوٹ کی بنیادی طلب یہ تھی کہ اُس کے خالق کو مانا جائے جس کے اشارۂ قدرت سے اُسے وجود کا لباس ملا۔

اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین نے خدا کی ہستی اور اُس کی صفات کو اس طرح نہیں بتایا جس طرح اسلام نے بتایا ہے اور نہ کائنات کے خالق کا وہ تصور پیش کیا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ کسی مذہب نے انسان کی پیشانی کو پتھروں کے سامنے جھکا دیا کسی نے درختوں اور ستاروں اور حشرات الارض کے سامنے سرِ تسلیم خم کرا دیا اور کسی نے انسان کو خود انسان کی پرستش کرنے کی

تعلیم دی۔ کسی نے بھی نہ تو خود انسان کی برتری کا وہ تصور پیش کیا جو اسلام نے پیش کیا ہے اور نہ اُس کے خالق و رازق کو اتنی عظمت و جلالت و بزرگی کے ساتھ بیان کیا جس طرح اسلام نے اسے بیان کیا ہے۔

وہ انسان جو کیڑوں مکوڑوں، سانپوں اور اژدھوں کو سجدے کر رہا تھا جسے یہ پتہ ہی نہ تھا کہ اُس کی فطرت میں کتنی بلندی ہے اُسے کسی اور نے نہیں بلکہ صرف اسلام نے بتایا کہ وہ کیا ہے اور اسکی تعلیم دی کہ وہ کائنات کا غلام نہیں بلکہ خود سردار ہے اور اُس کو دوسری مخلوق کی پرستش کا نہیں بلکہ اُن پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اور قرآن نے سورۂ اسرا میں اعلان کر دیا: (آیہ ۷۰)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ ہم نے اولاد آدمؑ کو عزت دی ہے اور ہم ہی نے اُس کو بحر و بر میں حمل و نقل کے وسیلے عطا کئے اور اُنھیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لیے دیں اور اُنھیں اپنی بہت سی مخلوق پر فوقیت دی ہے۔ انسانی فطرت بلندی چاہتی تھی تو اسلام نے

بھی اُس کے لیئے غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام کر دیا پس ایک اُسکے خالق ہی کی ایسی ذات ہو سکتی تھی جس کی عبادت کرنا اور اس کی تعظیم کرنا انسان کے لیئے فطری حیثیت سے ضروری تھا کیونکہ اسی کی ذات سے انسان کی زندگی، موت، رزق اور اُس کا باقی رہنا اور صحت و تندرستی سب کچھ وابستہ ہے۔ اس کو یاد کرنا اور اس کے سامنے جھکنا انسان کا سب سے بڑا بنیادی فرض تھا اور اُس کو پہچاننا اُس کے لیئے ضروری تھا اس لیئے اسلام نے پہلی تعلیم اسے یہی دی کہ وہ اپنی پیشانی اگر کسی کے سامنے جھکائے تو وہ صرف اللہ کی ذات ہونا چاہیئے۔ قرآن پاک کا اس سلسلہ میں یہ ارشاد ہے (انعام ۱۰۲) جس کا ترجمہ یہ ہے :۔

(اے لوگو! وہی تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ تو اسی کی عبادت کرو"۔

دین اسلام کی سب سے زیادہ اہم، گہری اور بنیادی تعلیم خالق عالم کا اعتقاد ہے جسے کسی دوسرے دین نے صحیح طور پر انسان کے سامنے کبھی نہیں پیش کیا سوائے اسلام کے جس نے تصورِ الٰہ کو اس کی پوری عظمت و برتری کے ساتھ ظاہر کیا ہے

کیونکہ اسی اعتقاد اور اسی نظریہ پر انسان کے اصلاحی نظام اور
اس کے صحیح کردار کی تخلیق ممکن اور موقوف تھی یہ انسانی فطرت کا
سچا تقاضا تھا کہ وہ اپنی برتری کو سمجھے اور اپنے خالق اور پروردگار
کی عظمت کا عقیدہ اختیار کرے۔ اسلام نے اُس کو فطرت کے
اس تقاضے سے آگاہ کیا اس کے بعد اسلام کی جس قدر بھی تعلیمیں
ملتی ہیں اُن میں فطرتِ انسانی کے تقاضوں کا پورا لحاظ موجود ہے
اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی

اسلام کی بنیادی تعلیموں میں دوسری چیز نبوت و رسالت
ہے جو انسان کی فطرت کا دوسرا تقاضا تھا۔ جب اس نے اللہ
کو مان لیا اور اس بات کو تسلیم کر چکا کہ اُس کا کوئی پیدا کرنے والا
موجود ہے اور اُس کی پیدائش کسی خاص غرض اور مقصد کے لئے ہوئی
ہے تو پھر اُس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ وہ اسے بھی جان لے کہ اللہ
کی کیا مشیت ہے اور وہ اپنی مخلوق سے کیا چاہتا ہے۔ اسی راز
کو بتانے کے لیئے ایسی بزرگ و برتر ہستیوں کی ضرورت تھی جو
اپنے عمل اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس منصب کی مستحق ہوں کہ
وہ اللہ کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچا سکیں اور خلق خدا کو
اُس کے فرائض سے آگاہ کریں۔ ایسے ہی لوگ نبی اور رسول کہے

جانتے ہیں۔ اس نبوت کے عقیدہ کو اسلام نے دوسرا درجہ عطا کیا ہے جو فطرتِ انسانی کا وجود خدا اور توحید کے بعد سب سے بڑا فطری تقاضا تھا کیونکہ اس کے بغیر انسان کا نظامِ زندگی مکمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلام نے انسان کو انسانی برادری کی قدر بتائی، معاشرتی زندگی کے اصول سمجھائے، اجتماعی روابط سے آشنا کیا اور زندگی کے ہر شعبہ اور حیات کے ہر گوشہ کیلئے اس کو ہدایات دیں۔

عبادت و اخلاق

اطاعت کی شدت کا نام عبادت ہے اور اس کا تعلق آدمی کی پوری زندگی پر پڑنا ضروری ہے۔ رہیں روحانی عبادتیں تو وہ عبادت کے اس وسیع تر مفہوم کا ایک روشن اور ضروری رُخ ہیں لیکن اُن کا بھی انسان کی سیرت، اخلاق اور اس کی عملی زندگی سے گہرا ربط ہوتا ہے اور مجموعی حیثیت سے عبادت کو سیرت اور اخلاق سے کسی طرح بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ عبادت کے مرتبہ اور درجہ ہی کے مطابق انسانی اخلاق کی قدریں بنا کرتی ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اخلاقیات کی تشکیل میں عبادت کے تصور اور اُس کے معیار کو بڑا دخل ہے اور اگر عبادت صحیح راستہ پر نہ ہوگی تو سیرت و اخلاق کی تعمیر بھی درست طریقہ پر نہیں ہو سکتی اسلام نے اسی لیئے انسان کو عبادت کا صحیح مفہوم بتا کر اس کے اس پہلے فرض سے آگاہ کر دیا ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرے اور کسی صورت میں بھی اس کام میں اُس کے غیر کو شریک نہ

کرے۔ اس فرض میں بھی اتنی وسعت اور جامعیت ہے کہ ایک توحید پرست اور مخلص مسلمان کے لیئے غیر اللہ کی ایسی کسی طاعت اور فرماں برداری کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا جو منشاءِ الٰہی کے خلاف ہو اور جس سے عبادت کے اس معیار میں فرق پیدا ہوتا ہو جو اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ یہی وہ اعلان ہے جسے ہر مسلمان اپنی ہر نماز میں کرتا رہتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ. (اے اللہ) ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد کے طالب ہیں۔ اس عبادتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی فکر و نظر کے تمام دھاروں کو سارے جہان سے موڑ کر صرف اللہ کے راستہ پر لگا دے اور توحید کے مرکز سے وابستہ رکھے۔ اسی میں اسے دنیا اور آخرت کی ہر کامیابی، فلاح ہر بلندی اور ناقابلِ تسخیر مادی اور اخلاقی طاقت کے سرچشمے مل جائیں گے۔

لیکن اگر وہ عبادت کے اس راز کو نہ سمجھ سکا اور اُس نے اس کی مرکزی روحانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے توحید کے مقصد کو ٹھیس لگائی اور اس طرح وحدہٗ لاشریک اللہ کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ میں اُس کے غیر کو شریک بنایا تو پھر اسی کے ساتھ اس

کا فکری انتشار اور نظری افراتفری اُس کی سیرت، کردار اور اخلاق کی تنظیم کو بھی پارہ پارہ کر دے گی اور انسان اُن قدروں کو حاصل نہ کر سکے گا جو اُس کی زندگی کا امتیاز ہیں اور جن کیلئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام میں عبادت کی مرکزیت کسی قسم کی بھی تقسیم اور کسی طرح کے بھی شرک کو قبول نہیں کر سکتی ورنہ اس کی وہ بنیاد ہی باقی نہ رہ سکے گی جس پر اُس کے فطری اور اخلاقی نظام کا انحصار ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ "پوری نظریاتی اور عملی زندگی پر حاوی اور شامل ہے، کیونکہ اُس نے جہاں انسان کے اعضاء و جوارح کے اس استعمال کو عبادت کہا ہے جو منشاء ایزدی کے مطابق ہو وہاں اُس نے فکر و نظر کو بھی عبادت قرار دیا ہے جو خدا کے مقرر کیئے ہوئے راستہ پر ہو۔ یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ انسانی فکر اور اُس کے نفسیات کی بناوٹ اس طرح کی ہے کہ وہ طرح طرح کے ماحول میں ڈھل سکتے ہیں۔ آدمی کا زاویۂ فکر اور اُس کے سوچنے کا طریقہ گرد و پیش کے حالات سے متأثر ہو سکتا ہے اور اسی لیئے اگر ساری دنیا کے انسانوں کو فکر کے ایک دھارے پر لانے کی کوشش کی جائے تو اس میں کامیابی حاصل کرنا عام سطح کے انسانوں کی قوت سے باہر ہے۔ اُس کے لیئے اگر یہ بات ممکن ہو سکتی ہے تو صرف

الٰہی مدرسۂ فکر و نظر سے ۔ یعنی دین اور صرف دین ہی وہ ذریعہ ہے جس کو خطّہ ، رنگ ، نسل ، خاندان ، قوم اور ملک یا زبان کے اختلافات اپنی گرفت میں لیکر شکست نہیں دے سکتے اور یہی وہ عظیم طاقت ہے جو ہر غیر معتدل اور ہر غلط رُجحان کو شکست دے سکتی ہے ۔

اسلامی فکر خود بھی عبادت ہے اور اُس کی ہر عملی شکل عبادت ہے اور " اسلامی اخلاق " اِسی فکر کی عملی صورت کا نام ہے ۔ اس طرح " اسلامی اخلاق " کا وجود اسلامی نظریۂ عبادت کی تشکیل کا ایک لازمی حصّہ ہے یعنی اگرچہ عبادت کا مفہوم اپنے مقام پر وسیع تر ہے لیکن سیرت و اخلاق کی تکمیل کے بغیر اس کا کوئی مفاد ہی باقی نہیں رہ سکتا ۔ اور اگر اسلامی عبادت کی قدریں موجود نہ ہوں تو پھر سیرت اور کردار کی تشکیل اسلامی نقطۂ نظر سے مطابق ممکن نہیں ہے ۔

ایک مرتبہ قریش کے کچھ بڑے سرداروں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں عرض کی کہ آئیے ہم اور آپ آپس میں اس طرح سمجھوتا کرلیں کہ ایک سال تک آپ ہمارے معبودوں کی پرستش کریں پھر دوسرے سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں اس

طرح ہم دونوں فریقوں کو ہر ایک کے دین اور مذہب اور طور طریقہ سے فائدہ حاصل ہوتا رہے گا۔ آپ نے جواب دیا۔: اللہ کی پناہ یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی غیر کو اللہ کا شریک بناؤں اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرنے لگوں۔ اسی سلسلہ میں "سورۃ الکافرون" کا نزول ہوا تھا جس میں اللہ کا ارشاد ہے :—

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ اے رسول کہہ دو کہ اے کافرو! میں اُن چیزوں کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس اللہ کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

اور آخر میں ارشاد ہوتا ہے :

"لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" تمہارے لئے تمہارا راستہ ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔ یعنی میں اپنے ہی طریقہ پر جو خدا کا مقرر کیا ہوا ہے ہمیشہ چلتا رہوں گا اور اگر تم اس طریقۂ زندگی اور نظامِ عبادت کو نہیں مانتے اور جس کا انکار کرنے پر جمے ہوئے ہو تو جمے رہو۔ میرا کام صرف پیغام حق پہونچا دینا ہے اگر تم سرکشی کرو گے تو اس کا نتیجہ خود ہی بھگتو گے۔ اس سے

صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ اسلامی نظریۂ عبادت توحید کی مرکزیت میں غیر اللہ کی ذرا سی بھی شرکت کی گنجائش نہیں رکھتا اس نظریۂ عبادت کا اعلیٰ ترین نمونہ اور مثال حضرت خاتم المرسلین کی سیرتِ پاک تھی اور چونکہ نظریہ کی عملی شکل کا نام "اَخلاق" ہے اسی لیئے آپ اُس منزلِ خُلق پر فائز تھے جہاں پر کائنات کی کوئی دوسری ہستی نظر نہیں آتی۔

وَاِنَّ لَکَ لَاَجرًا غَیرَ مَمنُونٍ ۚ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ ۝

(سورۃ القلم) اور تمہارے لیئے یقیناً وہ اجر ہے جو کبھی ختم ہی نہ ہوگا اور بے شک تمہارے اخلاق عظیم ہیں"۔ نظریۂ عبادت کی بلندی کا عکس انسانی اخلاق پر پڑنا ضروری ہے۔ نظریات ہی عادات وخصائل اور عملی صفات اور اَخلاق کی تخلیق کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیئے تکمیلِ اَخلاق کے لیئے نظریۂ عبادت کی تکمیل بہر حال ضروری ہے۔ ہم تمام توحید پرستوں کیلئے نظریۂ عبادت اور تکمیل اَخلاق کے معاملہ میں حضرت خاتمِ المرسلین سے بڑی کوئی مثال نہیں ہے اس لیئے ہمیں چاہیئے کہ ہم آپ کی سیرتِ پاک کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں اور اس مقدس سیرت کے مطابق اپنے اخلاق اور کردار کی تعمیر کریں تاکہ

ہم سچے مسلمان بن سکیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۔ (الاحزاب ۲۱)

مسلمانو! تمہارے لئے تو خود رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے مگر ہاں یہ اُس شخص کے واسطے ہے۔ جو خدا اور روزِ آخرت کی امید رکھتا ہو اور کثرت سے خدا کا ذکر کرتا ہو۔ خدا ہم سب کو سرورِ دو عالم کے نقشِ قدم پر چلنے اور آپ کی سیرتِ طیبہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آزادی کی اہمیت

دنیا کی یہ تاریخ ہے کہ ہمیشہ طاقتور اور فاتح قوموں نے کمزور اور شکست کھانے والی قوموں کو اپنا غلام بنایا ہے۔ یہ غلامی اپنی مختلف ہیبتناک شکلوں کے ساتھ ہر ملک اور ہر خطہ میں پائی جاتی تھی۔ کمزور ہر جگہ مظلوم تھا اور طاقتور ہر مقام پر عزت و اقتدار کا حقدار بنا ہوا تھا۔ آخر یہ کمزوری اور طاقت کا فرق اتنا بڑھ گیا کہ انسانی برادری میں کمزوروں کی جگہ بھی باقی نہ رہی اور وہ انسانی اور بشری افراد جن کی فطرت کو اللہ نے ان تمام صلاحیتوں سے نوازا تھا جو کسی عظیم ترین شہنشاہ یا کسی بڑے سے فلسفی، صنعتکار، سیاستداں یا کسی اور علم و فن کے ماہر میں موجود ہوتی ہیں، جانوروں کی طرح بازاروں میں بکنے لگے اور ان سے وہی کام لیے جانے لگے جو حیوانات سے لیے جاتے ہیں بلکہ ان کی حیثیت جانوروں سے بھی زیادہ پست ہو گئی۔ عربوں میں بھی قبائلی طریقۂ زندگی کی وجہ سے ہر وہ آدمی جس کو کسی گروہ اور قبیلہ کی سرپرستی

حاصل نہ تھی وہ دوسروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتا رہتا تھا اس لیئے کہ بہر حال نہ اُسکو کسی قبیلہ کی حمایت کا سہارا تھا اور نہ اس کے پاس مادّی وسائل ہی ایسے تھے جن کے ذریعہ سے وہ اس ظلم وستم سے بچ سکتا۔ اسلام نے اُس سسکتی ہوئی انسانی برادری کو سہارا دیا اور اُس سے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا اور وہ تمام حقوق اُس کو دیئے جن کے حاصل کرنے کا فطری طور پر اُسے حق تھا۔ اور یہی تو وجہ تھی کہ اسلام کی آواز پر قریش کے سرداروں سے پہلے اُن کے غلاموں اور کنیزوں نے لبّیک کی صدا بلند کی تھی کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اسلام ہمیں غلامی کی لعنت سے نجات دلانے آیا ہے اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے اور یہی وہ تنہا وسیلہ ہے جس سے ہم آزادی کے خواب کی تعبیر حاصل کر سکیں گے۔

اس غلامی کو دنیا سے مٹانے کے لیئے اور کمزوروں کو ان کی آزادی اور اُن کے تمام جائز حقوق دلوانے کے لیئے اسلام نے وہ سب کچھ کیا جس کی مثال دنیا کی پوری تاریخ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ اسلام آزادی اور حریّت کا علم بردار ہے اور اُس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ غلامی کے تصور کو اور غلامانہ ذہنیت کو انسانی

احساس سے مٹا دے اور انسان کو آزادی کے اصلی مقام اور قیمت سے آگاہ کر دے اور اُسے بتا دے کہ اسلام کے نزدیک اللہ کے سوا وہ کسی دوسرے کا غلام نہیں ہو سکتا۔ اب اس کے بعد یہ حقیقت خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ وہ ملت مسلمہ جو دوسرے کمزور افراد کے پیروں سے غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور جس کی خلقت ہی اسی کام کے لئے ہے کہ وہ دنیا کو آزادی کی نعمت حاصل کرنے کا موقع دے وہ خود غلامی کی لعنت کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے۔ مسلمان کی فطرت خدا کی غلامی کے سوا کسی دوسرے کی غلامی کو قبول نہیں کر سکتی۔

"ماسوی اللہ را مسلمان بندہ نیست"

صرف اللہ کی ذات ہے جس کی بندگی اور غلامی پر ایک سچے مسلمان کو فخر ہو سکتا ہے۔ مگر یہ بندگی اور غلامی وہ ہے جس سے بہتر کوئی آزادی نہیں ہو سکتی اور جس میں دنیا بھر کی سرداری اور قیادت کے راز چھپے ہوئے ہیں ایک طرف مسلمان کا سر اپنے اللہ کی بارگاہ میں جھکتا ہے اور دوسری طرف بلندی اور عزت اس کے قدم چومنے لگتی ہے اور اس کی پاک کتاب اس کا اعلان کرتی ہے:

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (سورہ آل عمران ۱۳۹) اگر تم میں سچا ایمان ہے تو بلندی اور عزت تم ہی کو ملے گی۔ اور تم ہی سب پر

غالب رہوگے - یہ عزّت واقتدار اور یہ غلبہ اور بلندی و برتری ظاہر ہے کہ اُسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب ہم آزاد ہوں اور آزادی کے پورے حقوق ہمیں حاصل ہوں - اگر ہم کسی دوسرے کے غلام ہوں گے اور اپنی قسمت کے خود مالک نہ ہوں گے تو کبھی ہمیں یہ بلندی اور عزّت حاصل نہیں ہوسکتی "ملّتِ مُسلمہ" کو خدا نے "خیرُ الاُمَم" یعنی دنیا کی ساری قوموں اور اُمّتوں سے افضل اور بہتر بنایا ہے اور اُسے دُنیا بھر کی سرداری اور رہنمائی کا منصب سونپا ہے -

کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَامُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنہَونَ عَنِ المُنکَر (آلِ عمران) تم تمام اُمّتوں سے بہتر اُمّت ہو جو لوگوں کی رہنمائی اور فلاح کے لیئے پیدا کی گئی ہے - تمہارا کام ہی یہ ہے کہ تم لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دو اور بُرائیوں سے منع کرو - اس طرح اللہ نے "ملّتِ مُسلمہ" کے مزاج میں حرّیتِ ضمیر کو داخل کیا ہے اور اُسے آزادی و سرداری کا وہ منصب دیا ہے جو کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے پھر یہ کیسے دوسروں کی غلامی کو برداشت کرسکتی ہے - اسلام نے انسانی معاشرہ سے غلامی کو مٹانے اور اُسکو آزادی دلوانے کیلیئے

جو کوششیں کی ہیں وہ قرآن کریم کی آیات، احادیث رسولؐ اور مسلمانوں کے عمل سے پوری طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ کوششیں انفرادی غلامی کو بھی دور کرنے کے لئے تھیں اور اجتماعی غلامی کو بھی۔ ہمارے اسلامی قوانین کی ایک بہت بڑی فہرست ہے جسکے تحت مسلمانوں کے لیئے اپنے غلاموں کو آزادی دینا لازمی اور ضروری بن جاتا ہے اور یوں تو کسی وقت بھی غلام کو آزاد کرنا انتہائی درجہ میں ثواب کا باعث ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (سورۃ البلد ۱۱-۱۴) انسان کو اللہ کی جانب سے اتنی نعمتیں ملنے پر بھی اس کی توفیق کیوں نہ ہوئی کہ وہ بلند گھاٹی پر سے گزرتا اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ بلند گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی گردن کا آزاد کرنا ہے۔ یا بھوک کے دن کسی رشتہ دار یتیم یا خاک نشین محتاج کو کھانا کھلانا ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی فلاح کے لیئے یہ ضروری ہے کہ اس سے غلامی کی ذلت کو دور کیا جائے خواہ وہ کسی قسم کی غلامی ہو۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس نیک کام میں کمزوروں کی مدد کرے تاکہ وہ آزادی کی نعمت حاصل

کر کے اپنی قسمت کی تعمیر خود کر سکیں۔

بے شک آزادی بھی ایک بڑی عزت ہے اور یہ حق صرف اُن ہی لوگوں کا ہے جو اللہ کی غلامی کے رشتہ میں جکڑے ہوئے ہیں انہیں عزت اور بزرگی اسی اللہ نے عطا فرمائی ہے جو خود ساری عزتوں اور بلندیوں کا حقیقی مرکز ہے۔ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (منافقون ۸) یعنی عزت و بلندی اللہ ہی کے لیئے ہے اور اس کے رسُول کے لیئے ہے اور صاحبان ایمان کے لیئے ہے"۔

اس کے ساتھ ہی اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ زمین پر ایمانداروں کو حکومت عطا کرے گا اور ان کے دشمنوں کی طرف سے انہیں بے خوف اور مطمئن کر دے گا:۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ م بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ط (سورۂ نور ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اُن سے خدا وعدہ کرتا ہے کہ انہیں زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ اس سے پہلے کے لوگوں کو اُس نے حکومت

دی تھی اور جس دین کو اُس نے اُن کے لیئے پسند کیا ہے اُس کو اُن کے لیئے قوت دیگا۔ اور اُن کے خوف کو امن و اطمینان سے بدل دے گا بشرطیکہ وہ میری عبادت کرتے رہیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں:

ہمارا سر بارگاہ ذوالجلال میں اُس کا شکر ادا کرنے کے لیئے خم ہے۔ اُس نے اپنی رحمت کاملہ سے ملتِ اسلامیہ پاکستان کو آزادی عطا فرما کر اُسے اپنا مستقبل تعمیر کرنے اور اپنی قسمت بنانے کا موقع عطا فرمایا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس عظیم نعمت کی قدر کریں اور اپنے ملک کی سالمیت اور اپنی آزادی کے تحفظ و بقا کے لیئے جو کچھ بھی کر سکتے ہوں وہ انتہائی اتحاد و اتفاق اور پورے خلوص کے ساتھ کریں۔

ہماری تاریخ، ہماری ثقافت و تہذیب، ہماری اقتصادی اور سماجی زندگی اور ہماری عزت و سربلندی سب کچھ ہماری آزادی سے وابستہ اور اسی پر منحصر ہے۔

ہم اگر اس آزادی کے تحفظ میں ذرہ برابر کوتاہی کریں گے تو کفرانِ نعمت الٰہی کے مرتکب ہوں گے اس آزادی کا تحفظ کرنا اور اپنی اس مملکت اسلامیہ کی سالمیت و

استحکام کی کوشش کرنا، کسی خاص فرد یا کسی خاص گروہ ہی کا فرض نہیں ہے کہ وہی کرے اور دوسرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں بلکہ اس ہمارے اسلامی معاشرہ کا ہر فرد اس عظیم ذمہ داری میں برابر کا شریک ہے۔

سیرۃ النبیؐ کا عملی پہلو

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَی
اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۵ (پارہ ۲۲، سورۂ احزاب، آیہ/۴۵-۴۶)

اے نبیؐ ہم نے تمہیں لوگوں کا گواہ اور نیکوں کو بہشت کی خوشخبری دینے والا اور بدکاروں کو عذاب سے ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اسی کے حکم سے دعوت دینے والا اور ایمان و ہدایت کا روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی چند خاص صفتوں کا ذکر ہے۔ آپ اپنی اُمت اور پچھلی اُمتوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔ نیک عمل لوگوں کو جنت کی بشارت دینے والے اور بدکاروں کو عذابِ خداوندی سے ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اسی کی اجازت اور اذن سے لوگوں کو بلانے والے اور چمکتا ہوا چراغِ ہدایت ہیں۔ اس کا خلاصہ یہی ہوا کہ آپ کی دعوت اِلَی الحق مشیّتِ الٰہی کے تحت اور اسکے مطابق ہے اور جو کچھ بھی آپ کا فرمان ہے وہ درحقیقت فرمانِ خداوندی ہے دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے اس کا اس طرح بھی اعلان فرمایا ہے: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ

يُوحٰى - (سورۃ النجم) آیہ/ ۳ـ۴

"اور وہ تو اپنی خواہشِ نفس سے بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے"۔ اس کے ساتھ ہی آپ سراجِ منیر اور روشن چراغ ہیں یعنی آپ نے دنیا میں ظاہر ہو کر جہالت و ضلالت کی تاریکیاں دور کر دیں اور سرتاپا نمونۂ ہدایت اور رہبری و رہنمائی کی بلند ترین عملی مثال بن کر تشریف لائے۔ بلاشبہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و عمل میں کبھی کوئی تضاد نہ تھا جو دل میں تھا وہی زبان پر اور جو زبان پر تھا وہی آپ کا عمل تھا۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگ کثرت سے آتے رہے جنہوں نے انسانی معاشرہ کو اخلاق اور آداب کے بہترین سبق دیئے۔ لیکن ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی ہیں جہاں زبانی تعلیم کی پشت پر سیرت کی ٹھوس عملی بنیادیں بھی ہوں کیونکہ صرف زبان سے اخلاقی تعلیم دینا بہت آسان ہے۔ مگر زبانی تعلیم کے ساتھ عملی نمونہ بھی پیش کر دینا مشکل ہوتا ہے۔ خیالات اور اعمال، نظریات اور کردار، گفتار اور سیرت کی یہ مطابقت اور ہم آہنگی اپنے پورے کمال کے ساتھ تو صرف ان ہی مقدس ہستیوں میں مل سکتی ہے جن کی تعلیم کی بنیاد خود انسان کے بنائے ہوئے منطقی قاعدوں

اور انسانی فکر و نظر کے ظاہری اور سطحی تقاضوں پر نہیں بلکہ خدائی احکام پر ہوتی ہے اور اس یقین و اعتماد پر ہوتی ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی منشاءِ خداوندی اور مقصودِ الٰہی ہے اور پھر اس کا بھی یقینِ کامل ہوتا ہے کہ جس خدا کے یہ احکام ہیں وہ اپنے بندوں کے ہر مخفی اور ظاہر عمل سے باخبر ہے۔ ان دو یقینوں سے جس مضبوط اور مستحکم کردار کی تشکیل اور جس عملی مثال اور بلند سیرت کی تخلیق ہوا کرتی ہے، اُس میں وقتی مصلحتوں اور ماحول کو دخل نہیں ہوتا اور وہ خطّوں اور رنگ و نسل و زبان و مکان کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے تغیّر و تبدیلی قبول نہیں کرتی اس کے برخلاف جہاں تعمیرِ کردار اور تعلیمِ اخلاق کی بنیاد صرف فکر و تحقیقِ نظری پر ہو وہاں ہر قدم پر یہ تبدیلیاں ممکن ہوتی رہتی ہیں اور بدلتا ہوا ماحول اور تغیّر پذیر مصلحتیں اصول و نظریات کو بھی بدل دیا کرتی ہیں یہی تو وجہ ہے کہ ایسی تمام تعلیمیں جن کی بنیاد صرف زبان اور کلام پر تھی وہ انسان کی رہبری نہ کر سکیں اور جہاں تعلیم اور ہدایت کی بنیاد زبان اور عمل دونوں پر تھی اور فکر و نظر پر منشاءِ خداوندی کی مہرِ تصدیق بھی ثبت ہو چکی تھی، اس نے انسان کے قلب و نگاہ کو تسخیر کر لیا اور اُسکی رہبری

اور رہنمائی کے سامنے سرِ خم کر دیئے گئے یہ وہ گروہ تھا جس کو ہم انبیاءؑ اور مرسلینؑ کہتے ہیں جنہوں نے ہر دور میں قول و عمل کے ذریعہ سے انسانی ضمیر کو بیدار کیا لیکن انبیاؑ اور مرسلینؑ کے پورے سلسلہ میں حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو مقام حاصل تھا وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے خدا کا پیغام پہنچانے میں بڑی کوششیں کیں جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں مگر اس کے باوجود اُن کی سیرت کا عملی پہلو اُمت کے سامنے بہت ہی کم رہا۔ کبھی وہ جنگلوں میں رہے کبھی صحراؤں میں رہے اور کبھی وہ قوم کی نگاہوں سے برسوں اوجھل رہے اور کبھی وہ غیبت کے پردوں میں چھپے رہے اور اگر قوم میں رہے بھی تو لوگوں کے سامنے اُن کے اقوال زیادہ رہے اور اُن کی عملی زندگی پوری طرح نظر کے سامنے نہ آسکی یہ بات اگر کہیں پورے کمال پر ملتی ہے تو وہ صرف پیغمبر اسلامؐ ہی کی ذات اقدس ہے۔ آپ کی سیرت پاک کا ہر پہلو ہمارے سامنے موجود ہے۔ بچپنے سے بڑھاپے تک زندگی کے ہر دور میں اور ہر کاروانِ حیات کے ہر قدم پر آپ کی سیرتِ پاک مجسم نور بنکر ہمارے لیئے رُشد و ہدایت کا بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ ایک مصلح ایک اُستاد ایک حاکم، ایک

سپہ سالار، ایک شوہر، ایک دوست، ایک تاجر اور ایک مزدور سب ہی کیلئے آپکی سیرت کے عملی نمونے اجاگر اور بے نقاب ہیں اور ہر عُمر اور ہر طبیعت کا انسان اپنی اپنی قابلیت کے مطابق آپ کی ذات سے کسب کمال کر سکتا ہے اور اس کو اپنے ہر پہلو کے لئے عملی مثال بنا سکتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآنِ پاک میں اللہ نے اشارہ فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: تم کہدو کہ اگر اللہ کی مشیّت یہی ہوتی تو نہ تم کو یہ کلام پڑھ کر میں سنا سکتا اور نہ اللہ ہی تم کو اس کی اطلاع کرتا یعنی یہ اللہ کا کلام ہے جو میں تم کو سناتا ہوں اور اسی کی اجازت اور حکم سے سناتا ہوں، فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (سورۂ یونس آیت ۱۶ پارہ ۱۱) اور میں تم میں اس سے قبل مدتوں رہ چکا ہوں تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے" مطلب یہ ہے کہ تم نے اعلانِ نبوت سے قبل چالیس برس تک میری نجی زندگی کو خوب اچھی طرح دیکھا ہے اور تم اس میں کوئی عیب نہ پا سکے تو اب کس منہ سے نکتہ چینی کرنے کی تمہیں جرات ہو سکتی ہے۔ چونکہ سب سے پہلا محاسبہ خود مُصلح کی نجی زندگی ہی پر کیا جاتا ہے اس لیئے حکمِ خداوندی تھا کہ رسول اللہ لوگوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائیں۔ غرض آپ نے دنیا والوں کو نیکیوں کا جو سبق دیا ہے وہ صرف زبانی سبق نہیں ہے بلکہ آپ کی سیرتِ پاک میں

اس کی عملی مثالیں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔

اگر آپ نے عدل و انصاف کا حکم دیا تو خود بھی انصاف و عدالت کی بہترین مثالیں پیش کیں۔

اگر اخوت اور محبت کی تعلیم دی تو خود بھی اس پر عمل فرمایا اگر جہاد کی دعوت دی تو خود بھی میدان جنگ میں تیروں اور تلواروں کی زد پر تشریف لے آئے۔ اگر صلح کا حکم دیا تو خود بھی صلح کا نمونہ پیش کر دیا۔ اگر دشمنوں کو معاف کر لینے اور قاتلوں سے درگذر کرنے کی تعلیم دی تو خود بھی اس کی مثال پیش فرمائی۔ اگر زمانہ کی شدتوں اور تکلیفوں پر دوسروں کو صبر کی تلقین کی تو خود بھی بہترین صبر و شکیبائی کی مثال پیش کر دی۔ اگر لوگوں کو محنت و مشقت کی طرف رغبت دلائی تو بہ نفس نفیس خود بھی مزدوروں اور غریبوں کیساتھ ملکر محنت اور جفاکشی کے طریقے سکھا دیئے۔ اس طرح رہتی دنیا تک آنیوالی تمام انسانی نسلوں کے لیئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیرت اور کردار کی ایسی روشن اور منور عملی مثالیں پیش کر دی ہیں جو زندگی کے ہر پہلو اور حیات کے ہر شعبہ کے لیئے ہمیشہ منارۂ رشد و ہدایت بنی رہیں گی۔

مجاہدوں کے متعلق ہمارا فرض

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ (الانفال آیہ/۷۴)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ایسے نازک وقت میں ان صاحبانِ ایمان اور ان مجاہدین کی نصرت و اعانت کی یہی لوگ تو سچے ایماندار ہیں اور ان ہی کے لیئے مغفرت اور عزت و آبرو کا رزق ہے"۔ قرآنِ کریم کا یہ ارشاد ہے جس میں مہاجروں اور ایمان رکھنے والوں کی اعانت و امداد کرنے والے اشخاص کو سچا مومن فرمایا گیا ہے اور اس نصرت کو سچے ایمان کی نشانی قرار دیا دیا گیا ہے۔

"خدا کی راہ میں جہاد کرنے والا دینِ خدا کا مددگار ہے" وہ الٰہی پیغام کو پہنچانے کے لیئے اور دین خدا کی حفاظت کے لیئے قربانیاں پیش کرتا ہے اس لیئے ہر اُس شخص کا فرض ہے جو

اللہ اور قیامت پر لیقین رکھتا ہے، جو دل سے خدائے برتر کی عظمت واقتدار کا اقرار کرتا ہے کہ وہ ان جہاد کرنے والوں کی ہر صورت سے اعانت وامداد ونصرت کرے جو اُس کے امکان اور اُس کی قدرت میں ہو۔ مجاہد کی مدد کرنے والا بھی دین خدا کا ناصر ہے اور خدا نے اس کا اعلان فرمایا ہے کہ جو خدا کے دین کی مدد کرے گا اُس کی اللہ بھی نصرت کرے گا۔ (سورۂ محمد/۸) میں اسی کی طرف اشارہ ہے، "یَآیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ"

اے ایمان والو اگر تم خدا کی نصرت کرو گے تو خدا بھی تمہاری نصرت و مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو ثبات عطا فرمائیگا۔

"وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّھُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ۔"

اور کافروں کے لئے تو تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ خدا اُن کی ترکیبوں اور کوششوں کو برباد کرے گا"۔

جب اسلام پر مسلمانوں کے ملک پر کوئی حملہ آور ہو تو اُس کا دفاع کرنا اور خدا کے دین اور اس کے ملک کو بچانا ہر مسلمان کا سب سے بڑا فرض ہے اور اس

فرض کی ادائیگی میں ذرہ برابر کوتاہی کرنا، غفلت اور سستی کرنا نہ صرف جرم اور گناہ ہے بلکہ خدا کے دین اور کلمۂ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے بغاوت ہے اور ایسے لوگ دنیاوی سزاؤں کا بھی پورا استحقاق رکھتے ہیں اور خدائی قہر و عذاب کے سزاوار بھی ہیں۔

سعی و کوشش کا دوسرا نام جہاد ہے اور یہ کوشش صرف ایک ہی طریقہ سے نہیں ہوتی اور نہ کسی خاص فرد سے مخصوص ہے بلکہ یہ ہر انسان کا فریضہ ہے اور اس سعی کا دائرہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو جہاد کی ایک قسم ہے کہ ہم اسلام کے دشمنوں کے سامنے مسلح ہو کر میدان میں آجائیں اور اپنا آخری قطرۂ خون بھی دین حق کی راہ میں اور ناموسِ اسلام کے وقار و عزت کے تحفظ میں صرف کر دیں۔ بلاشبہ یہ جہاد کی آخری منزل ہے مگر اسی کے ساتھ جہاد تو مسلمان کی پوری زندگی کا نام ہے وہ سچا مؤمن اور مخلص مسلمان کہاں ہو سکتا ہے جس کا ہر قدم جہاد نہ ہو۔ اسلام کی اصطلاح میں اِعلائے کلمۂ حق یعنی حق کے اونچا کرنے کی جان توڑ کوشش کا نام جہاد ہے، یہ کوشش

کبھی دل اور دماغ سے ہوتی ہے تو کبھی قلم اور تلوار کی دھار سے خصوصاً جب کبھی اسلام مٹ رہا ہو اور کعبہ کے وقار کو ٹھیس لگ رہی ہو جب محمدؐ عربی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پیغام کو مٹانے کے لیئے کافروں کی شیطانی ٹولیاں صف بستہ ہو چکی ہوں اور جب گائے اور لنگوروں، بندروں اور بیجّر کے بے جان بتوں کے غلام اور اُن کے سامنے ناک رگڑنے والے لوگ فرزندِ آمنہؑ اور رسولِ بطحاؐ کی فوج کو للکاریں اور نورِ خدا کو اپنی ذلیل پھوکوں سے بجھانے کے لیئے جنگی مکّاریوں اور سازشوں میں جان کی بازی لگا چکے ہوں تو ایسے امتحانی وقت میں مسلمانوں کا کیا فرض ہے اس سے واقفیّت رکھنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ جہاں ہماری بہادر، جانباز اور جرّار فوجوں کا یہ کام ہے کہ وہ ہماری طاہر و مطہّر سرزمین کے چپہ چپہ سے دشمنانِ اسلام کی نجاست، گندگی اور شیطنت کے خطرہ کو ہمیشہ کے لیئے دفع کر دیں اور اسلام کے کمینے دشمنوں کو وہاں تک ڈھکیل دیں جہاں سے پھر کبھی وہ مسلمانوں سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کر سکیں اسی کے ساتھ ہر کلمہ گو کا فرض ہے کہ وہ اسلام و کفر کی جنگ میں مجاہدین

اسلام کی ہر ممکن مدد کرے۔ یہ مدد اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ جہاد راہِ خدا کے نام پر اپنے مال سے امداد کرے اور دل کھول کر اُس خدائے برتر کے نام پر عطیات دے اور مالی قربانیاں پیش کرے۔ جس سے وہ ہر آن روزی عطا کرنے کی دعا کرتا ہے۔ یہ اس طرح بھی ممکن ہے کہ جو لوگ میدانِ جنگ میں جانے کے قابل ہیں وہ فوراً ایسے جہاد میں شامل ہونے کے لیئے اپنے کو پیش کردیں اور مجاہدین کی تیار اور قابل فخر فوجوں میں اپنا نام شامل کرلنے اور فتح یا شہادت کا شرف وعزت حاصل کرنے کی کوشش کریں یہ امداد اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ ہم ملک کے تمام ذاتی وجماعتی اختلافات کو فراموش کرکے پوری یک جہتی کے ساتھ دشمنانِ اسلام کا منہ توڑ دیں اور مسلمان بچوں، عورتوں اور غریبوں پر ظلم کرنے والے کفر وشرک کے بھیڑیوں کا صفایا کرڈالیں۔

یہ امداد اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے مجاہدوں کے گھروں کی دیکھ بھال کریں، اُن کے لیئے ہتھیار فراہم کرنے کی بھرپور کوشش کریں، اُن کی ہمت بڑھائیں، ملک میں غلط افواہیں پھیلانے والوں پر کڑی نگاہ رکھیں اور اپنی حکومت

اور اپنی فوج کا ہر طرح ہاتھ بٹائیں، چور بازاری نہ کریں، نفع خوری نہ کریں، موقع سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں اور ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے دشمنوں کو ذرہ برابر فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔ پاکستان لاکھوں مسلمانوں کے خون کی بوندوں سے بنا ہے، پاکستان کرۂ زمین کی عظیم ترین اسلامی سلطنت ہے، پاکستان کا وقار اسلام کا وقار ہے، اس کی عزت اسلام کی عزت ہے، اس کے دشمنوں سے جہاد کرنے والوں کی اعانت وامداد کرنا ہمارا مذہبی، انسانی اور اخلاقی فرض ہے اور اس میں کسی قسم کا تغافل کرنا بدترین لعنت کا استحقاق ہوگا۔ اسلامی تاریخ تو سرفروشانہ جنگوں کی تاریخ ہے۔ ہمیشہ اسلام کے دشمن مختلف روپوں میں اس پر حملہ کرتے رہے اور آج بھی اُن کی تاریخ اُن کی ناپاک ذریت مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر دہرا رہی ہے لیکن ہماری یہ تاریخ ہے کہ جب کبھی ہمارے بے جگر بہادروں نے میدان سنبھالا ہمارے ہر فرد نے اُن کی مدد کی یہاں تک کہ مسلمان بچوں اور عورتوں، ضعیفوں بوڑھوں

اور کمزوروں نے بھی کبھی اپنے خدمات پیش کرنے سے دریغ نہیں نہ کیا۔ جنگ خیبر میں جب پیغمبر اکرمؐ نے عورتوں سے دریافت فرمایا کہ تم اس جنگ میں کیا کام کروگی؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے پاس زخمیوں کے لیئے دوائیں بھی ہیں اور ہم میدان سے تیر اٹھا اٹھا کر لائیں گے اور مجاہدوں تک پہنچائیں گے۔ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے کہ اکثر غزوات میں مسلمان عورتیں بھی اسلامی لشکر کے ساتھ رہتی تھیں جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں اور ابو داؤد نے یہاں تک بھی لکھا ہے کہ وہ تیر اٹھا اٹھا کر لاتی تھیں اور مجاہدین اسلام کی اس صورت سے مدد کرتی تھیں جنگ اُحُد وغیرہ میں اَزْ وَاجِ مطہرات کا پانی کی مشکیں بھر بھر کے لانا اور پیاسے زخمیوں اور مجاہدوں کو پلانا بھی مذکور ہے۔ اسی جنگ میں حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کا ذکر بھی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے، جنہوں نے رسولؐ کے زخمی ہونے کی خبر سن کر میدان کا رخ کیا اور پیغمبرؐ کے زخمی چہرۂ اقدس کو خون سے صاف کیا جبکہ بنتِ رسولؐ ہاشمی خواتین کے حلقہ میں پوری پردہ داری کے

ساتھ تھیں۔ فخرِ انبیاؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ اپنے بھائی حضرت حمزہؓ کی خبرِ شہادت سنکر میدانِ جنگ کی طرف چلیں جب جنابِ رسالتمآبؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ انھیں حمزہؓ کی لاش پر نہ لیجاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھائی کی لاش نہ دیکھ سکیں مگر صفیہؓ نے کہا کہ میں اپنے بھائی کا کل ماجرا سن چکی ہوں لیکن یہ خدا کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں ہے مجھے لاش پر جانے کی اجازت دی جائے یہ سنکر پیغمبرؐ اکرم نے اجازت دی اور بہن اپنے بھائی کی لاش پر گئی اور اپنی آنکھوں سے بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے لیکن سوائے شکرِ خدا کے منہ سے کچھ نہ کہا۔ حضرت رافعؓ کا سن کم تھا اور قد چھوٹا تھا اس لئے جب فوج کی بھرتی شروع ہوئی تو وہ اپنے انگوٹھوں کے بل اونچے کھڑے ہو گئے تاکہ انھیں لوگ جنگ کے لیئے چن لینے سے انکار نہ کر دیں۔ جس قوم کی تاریخ کی بنیادیں بدر و خیبر و اُحد و خندق کے معرکوں پر قائم ہوں جس قوم کی رگوں میں اِس پیغمبرِ عظیم کا کی گونج ہو، " اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ" ننگ و عار اور ذلّت و رسوائی کی برداشت سے موت بہتر ہے جس قوم کی پوری زندگی قربانیوں کا دوسرا نام ہو اُس کے لیئے اب پھر

ایک مرتبہ آزمائش اور امتحان کی گھڑی آچکی ہے۔ لاتؑ و ھُبلؔ
کے پجاریوں کی اولاد فرزندانِ توحید سے برسرِ پیکار ہے آج
بھی صنم پرستی اور خدا پرستی کا مقابلہ ہے۔ اسلام پر ہر طرف
سے کفر و بے دینی کا دھاوا ہے۔ اس امتحان کی آگ کے سامنے ہمارے
ایمان کی طاقت اور جذبۂ حق پرستی کی قوت کی جانچ کا وقت
آگیا ہے۔ ہمارے بہادر آباؤ اجداد کی وہ امانت جو ہمارے دلوں
اور سینوں کے خزانوں میں محفوظ ہے یعنی خدائے واحد
پر سچا ایمان اب اُس کے پرکھنے کی گھڑی آچکی ہے ہم
اُس خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو سمیع و بصیر ہے، اُس اللہ نے
ایمان والوں کی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ (سورۂ المؤمن/۵۱)
اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ
یَقُوْمُ الْاَشْہَادُ۔" ہم ضرور اپنے رسولوں اور ان لوگوں
کی جو ایمان لا چکے ہیں مدد و نصرت کریں گے، اس دنیاوی
زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خدا کا وعدہ سچا ہے اور
وہ ضرور ہماری نصرت فرمائے گا اور کفر و بدعت کے مٹانے
میں ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔ جس قوم کی آنکھوں میں
حمزہؓ اور جعفرؓ بن ابی طالب کے حملوں کا رعب اور جلالت

بھری ہوئی ہے جس کی رگوں میں ابدالی اور غزنوی کا خون دوڑ رہا ہو جو صلاح الدین ایوبی اور تیمور کی خارا شگاف تلواروں کی وِرثہ دار ہو جسکے وِرد زبان فاتح خیبر حیدرؓ کرار کا نام ہو جس کے سر پر روح شبیریؑ کا سایہ ہو اور جسکے کانوں میں شبِ عاشور حضرت قاسمؑ بن الحسنؓ جیسے کم سن بچہ کی یہ آواز گونج رہی ہو اَلْمَوْتُ اَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ اے میرے چچا حسینؓ بن علیؑ آپ پر میری جان نثار ہو" موت کو تو میں شہد سے زیادہ میٹھا سمجھتا ہوں"۔

جس قوم کے سامنے ازواجِ رسولؐ کی عظیم قربانیاں، اصحابؓ کرام اور اُن کے ناموس اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی اسلامی خدمتیں روشن آفتاب کی طرح جگمگا رہی ہوں جکی تاریخ ابوایوبؓ انصاری اور مالکؓ اشتر کے ولولوں سے بھری ہو جس قوم نے بابرؒ اور حیدرعلی جیسے سپوت پیدا کیئے ہوں، اس کے پھر امتحان کا وقت آیا ہے - یہ ہمارا دِفاعی جہاد ہے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ عام جہاد تو عورتوں بچوں، بوڑھوں اور مجبوروں پر سے ساقط ہے لیکن دِفاعی جہاد کسی پر سے ساقط نہیں ہے - اور عام جہاد ہو یا دِفاعی جہاد، ہو

مجاہدین کی اعانت کرنا تو ہر حال میں واجب اور ضروری ہے اور اس سے ذرا سی پہلو تہی کرنا، غفلت کرنا، سستی کرنا اور اپنے فرض کو محسوس نہ کرنا اسلام کُشی اور کفر نوازی ہے، حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:-

اَلجِہَادُ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الجَنَّۃِ "

جہاد جنّت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے

پیغمبر مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا فرمان ہے:-

اَلخَیرُ کُلُّہٗ فِی السَّیفِ وَتَحْتَ ظِلَالِ السَّیفِ وَلَا یُقِیمُ النَّاسَ اِلَّا السَّیفُ وَالسُّیُوفُ مَقَالِیدُ الجَنَّۃِ وَالنَّارِ۔"

ہر نیکی تلوار کے اندر اور تلوار کے سایہ میں ہے اور مکّار و ظالم انسانوں کو تلوار ہی درست کر سکتی ہے۔ تلواریں ہی جنّت و جہنم کی کنجیاں ہیں اگر یہ کفر کے مقابلہ میں اٹھیں گی تو جنّت کی ضمانت بنیں گی اور اگر ظلم کے لیئے چلائی جائیں گی اور خدا کے دین کو مٹانے کے لیئے استعمال کی جائیں گی تو قہر الٰہی کی آگ کے شعلے اِن کو جلا کر خاک کر دیں گے اِس وقت ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ پورے اتحاد و اتفاق اور آپس کی یکجہتی"

خلوص اور یگانگت کیساتھ اور اپنے سارے اختلافات کو بھول کر ایک جان اور ایک دل ہو کر ناقابل تسخیر چٹان بن جائے اور دشمنانِ پاکستان کی سازشوں اور ناپاک حسرتوں کو پاش پاش کرد ے اور اس خدائی فرمان پر ایمان رکھے :-

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ؕ

مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو صاحبِ حکمت ہے اور سب پر غالب ہے۔

مجاہدوں کی اعانت

دینِ حق کی حفاظت اور مسلمانوں کی نُصرت وحمایت اور باطل سے معرکہ آرائی کے لیے جان توڑ سعی و کوشش اور جِدّ وجُہد کرنے کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے یہ کوشش کبھی تو دل و دماغ اور فکر و نظر سے ہوتی ہے۔ کبھی یہ جہاد قول وعمل سے ہوتا ہے، کبھی مال ودولت سے اور کبھی قلم کی نوک اور تلوار کی دھار سے غرض دینِ اسلام کی برتری، بقا، اور حفاظت، مسلمانوں کی باوقار زندگی، اُن کی مذہبی آزادی اور اسلامی مملکت کی سالمیت واستحکام کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا جہاد ہے۔ مجتہدین اسلام نے جہاد کی صاف اور واضح قسموں میں ایسی صورتوں کو داخل کیا ہے جب کفّار کی طرف سے مملکت اسلام پر حملہ کیا جائے یا حملہ کا یقینی خطرہ پیدا ہو جائے یا کسی جگہ پر اور کسی صورت میں بھی مسلمانوں کی جان ومال کے لیے کسی نقصان کا خوف پیدا ہو۔

پاکستان پر دشمنانِ اسلام کے جارحانہ حملوں کے پیشِ نظر

مدافعت کی ہر لڑائی قطعی طور پر "اسلامی ہوگی" خصوصاً جبکہ چڑھائی کرنے والا ایک مشرک ملک ہو جس نے اسلامی مملکت پر حملہ کیا ہو۔ اور جبکہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے اس کے حملہ سے اور ساتھ ہی اسلامی مملکت کے وجود اور سالمیّت کو خطرہ لاحق ہوگیا ہو اور جبکہ اس کے جارحانہ اقدام اور مکّارانہ اور وحشیانہ حملوں سے مسلمان مملکت کے باشندوں کی جان و مال خطرہ میں ہو۔ ان اہم بنیادی امور کے نتیجہ میں ایسی لڑائی میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے لازمی طور پر "جہاد فی سبیل اللہ" کا حکم رکھتا ہے چونکہ ایسا جہاد دفاعی ہوتا ہے جس کی اجازت شریعت کی طرف سے ہمیں ہر وقت حاصل ہے اس لئے یہ کسی مسلمان سے کبھی ساقط نہیں ہو سکتا۔ یعنی جس طرح یہ مردوں پر واجب ہے اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے، یہ مریضوں اور بوڑھوں پر بھی واجب ہے، یہ جس طرح آنکھوں والوں پر واجب ہے اسی طرح اندھوں پر بھی فرض ہے۔ اسکی مقدرت اور صلاحیت کے مطابق۔ یہ دفاعی جہاد جس طرح بالغ افراد پر فرض ہے اسی طرح ہر اُس نابالغ بچہ پر بھی فرض ہے جو عقل و شعور اور قوّت و طاقت رکھتا ہو۔ تکلیفی احکام شریعت میں کسی بچہ کے مکلّف ہونے کی شرط اُس کا بلوغ

کی عمر تک پہنچنا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کے واجب ہونے میں بلوغ کی کوئی شرط نہیں ہے جیسے اس کی اپنی جان کا بچاؤ یا اسی طرح کی دوسری محترم جانوں کا تحفظ پھر اسلام اور مملکتِ اسلامیہ کا تحفظ تو ایک فرد یا چند افراد کی زندگی سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لیئے جہاد میں شرکت کرنے کا وجوب نابالغ بچوں تک سے ساقط نہیں ہے جبکہ وہ فہم و شعور اور قوت و طاقت رکھتے ہوں - اس بنا پر ہر مسلمان کے لیئے اپنے مقدور بھر دشمنانِ اسلام کے خلاف اسلامی دفاعی جہاد میں حصّہ لینا واجب و لازم ہے اور اس سے پہلو تہی کرنا قطعاً حرام ہے جو لوگ میدانِ جنگ میں جا سکتے ہیں انھیں بغیر کسی انتظار کے فوراً چلا جانا چاہیئے اور جو لوگ میدانِ کارزار میں نہیں جا سکتے اُنھیں اس جہاد میں مال و دولت سے، ملکی نظم و ضبط قائم رکھنے سے، افواہیں روکنے سے، مکّار دشمن کی جنگی چالوں اور سازشوں کو ناکام بنانے سے، مجاہدوں کے ساتھ ہر طرح کے تعاون کرنے سے اور عوام کا حوصلہ بلند کرنے کے ذریعہ سے ایسے مقدس جہاد میں اپنا حق ادا کرنا چاہیئے - دسویں صدی ہجری کے مشہور ترین مجتہد الشیخ زینُ الدّین العاملیؒ شہید ثانی

علیہ الرحمۃ (متوفی ۹۶۶ھ) کتاب "لمعۂ دمشقیۃ" کی شرح میں اقسام جہاد پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وَجِهَادُ مَنْ يَدْهَمُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ مِنَ الْكُفَّارِ بِحَيْثُ يَخَافُونَ اِسْتِيلَاءَهُمْ عَلَى بِلَادِهِمْ أَوْ أَخْذِ مَالِهِمْ وَمَا أَشْبَهَهُ" مسلمانوں پر حملہ کرنے والے کافروں سے دفاعی جنگ کرنا بھی "جہاد" ہے جبکہ اس بات کا خوف ہو کہ وہ مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کر لیں گے یا اُن کے اموال وجائداد پر تسلط حاصل کریں گے یا اسی طرح کا کوئی اور خوف ہو۔ اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے "وَجِهَادُ مَنْ يُرِيدُ قَتْلَ نَفْسٍ مُحْتَرَمَةٍ أَوْ أَخْذَ مَالٍ أَوْ سَبْيَ حَرِيمٍ مُطْلَقًا" اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی مسلمان کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو یا اس کے مال ودولت کو لوٹنا اور اس کے گھر والوں کو قیدی بنانا چاہتا ہو تو دوسرے مسلمان کے لئے اس ظالم سے جنگ کرنا اور مظلوم کا تحفظ کرنا بھی جہاد ہے۔ علامہ نے اس کے بعد تحریر فرمایا ہے: أَوْ هُجُومِ عَدُوٍّ عَلَى الْمُسْلِمِينَ يُخْشَىٰ مِنْهُ عَلَى بَيْضَةِ الْإِسْلَامِ فَيَجِبُ حِينَئِذٍ بِغَيْرِ إِذْنِ الْإِمَامِ أَوْ نَائِبِهِ یعنی ان تمام صورتوں میں جنہیں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا اور ایسی صورت میں بھی جب اسلام کا وقار خطرہ میں

پڑ جائے، حملہ آور کفار سے جنگ کرنا اور اسلام اور مسلمانوں کو غیر مسلم طاقتوں کی جارحیت سے بچانا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ علامہ نے دفاعی جہاد کی عمومیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: اَمَّا الثَّانِیْ فَیَجِبُ الدَّفْعُ عَلَی الْقَادِرِ سَوَاءً الذَّکَرُ وَالْاُنْثٰی وَالسَّلِیْمُ وَالْاَعْمٰی وَالْمَرِیْضُ وَالْعَبْدُ وَغَیْرُهُمْ۔" دفاعی جہاد ہر قدرت رکھنے والے مسلمان پر واجب ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت ہو، تندرست ہو، مریض ہو، اندھا ہو، غلام ہو یا صاحب شعور نابالغ ہو یا اسی طرح کے دوسرے افراد ہوں"۔ علامہ نے اس کے بعد لکھا ہے " وَلَوْ خِیْفَ عَلٰی بَعْضِ الْمُسْلِمِیْنَ وَجَبَ عَلَیْهِ فَاِنْ عَجَزَ وَجَبَ عَلٰی مَنْ یَلِیْهِ مُسَاعَدَتُهٗ فَاِنْ عَجَزَ الْجَمِیْعُ وَجَبَ عَلٰی مَنْ بَعُدَ" اگر یہ حملہ مسلمانوں کے کسی ایک فرد یا گروہ پر ہو تو خود اس فرد یا اس گروہ پر اس کا دفاع کرنا واجب ہے لیکن اگر وہ مسلمان فرد یا گروہ تنہا حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے تو پھر دور دراز مقامات کے ہر مسلمان پر اس کی حمایت اور مدد کرنا واجب ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو بشرطیکہ وہ مدد کر سکے اور امداد پر قدرت رکھتا ہو۔ فقیہ اعظم حضرت شہید ثانی علیہ الرحمۃ کے اس فتوے کی روشنی میں ہمارا راستہ پوری طرح واضح ہو گیا ہے

کہ اُس وقت جبکہ کسی مملکت اسلامیہ پر مشرکوں اور کافروں نے اپنے ناپاک گٹھ جوڑ کے ساتھ بھرپور حملہ کردیا ہو تو ہمارے بچہ بچہ پر واجب ہے کہ وہ میدانِ کارزار میں سر سے کفن باندھ کر نکل آئے اور اسلام کی طرف ہر اٹھنے والی سازشی آنکھ کو اندھا کر دے اور اس کی طرف بڑھنے والے ہر جارحانہ قدم کو کاٹ ڈالے۔ یقیناً یہ جہاد ایک اسلامی ملک کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا جہاد ہوگا۔ یہ صرف دو ملکوں کی لڑائی نہیں بلکہ اسلام و کفر کی جنگ ہوگی۔ دشمنانِ اسلام کی ہمیشہ یہ ناپاک کوشش رہی ہے کہ وہ دنیائے اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں اور مسلمانوں کی مرکزیت کسی صورت سے بھی قائم نہ ہونے دیں۔ اس لیئے اب یہ دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کا مسئلہ بن گیا ہے اور اُن کا شرعی اور اسلامی فرض ہوگیا ہے کہ وہ دشمنوں کے نجس اور خونخوار جبڑوں سے مسلم معاشرہ کا تحفظ کریں اور اب یہ فرض خود غیر مسلم ممالک کے اندر بسنے والے مسلمانوں پر بھی عائد ہوتا ہے کہ جس طرح سے بھی اُن کے لیئے ممکن ہوسکے وہ اس جہاد میں عالمِ اسلام کی مدد کریں اور دشمنِ اسلام طاقتوں کی مکاریوں

اور سازشوں کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کریں خصوصاً پاکستان کا وجود اور اس کے وقار کا تحفظ نہ صرف اس خطّہ پاک کے مسلمانوں کی زندگی اور آزادی کے لیئے ضروری ہے بلکہ پاکستان کی عزّت سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی عزّت اور وقار وابستہ ہے۔

اگر خدانخواستہ اس اسلامی مرکز کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو پھر دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے لیئے غیر مسلم لوگوں کے ظلم وستم سے پناہ حاصل کرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ یہی ایک ایسی پناہ گاہ ہے جہاں وہ اپنی زندگی اور اپنے ناموس کی عزّت وآبرو بچانے کے لیئے پناہ لیتے رہے ہیں اور آئندہ بھی پناہ لے سکتے ہیں۔ یہ صرف پاکستان کا خوف ہی تھا جس کی وجہ سے اب تک ہمارے ایک پڑوسی ملک میں مسلمانوں کو زندہ رہنے دیا گیا ہے لیکن اگر ظالموں کو پاکستان کا خوف نہ ہوتا تو اب تک برّصغیر کے اُن خطّوں میں مسلمانوں کا نام ونشان تک باقی نہ رکھا جاتا۔ اس بنا پر بیرونی مسلمانوں کا بھی یہ شرعی فریضہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف دشمنوں کی جارحیّت اور اُنکی تمام

سازشیں ہر اُس کوشش کے ساتھ پاش پاش کر ڈالیں
جو اُن کے لیئے ممکن ہو سکے۔ قرآن میں اللہ کا صریحی حکم موجود
ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ ص وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط (ترجمہ) نیکی اور پرہیزگاری میں
ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں کبھی تعاون
نہ کرنا اور خدا سے ڈرتے رہو (پ۶ مائدہ آیت ۲)

اس لیئے جان بوجھ کر غیر مسلموں کی جارحیت میں کسی
مسلمان کا شرکت کرنا اللہ کے اس صریحی حکم کی خلاف ورزی
اور گناہ عظیم ہوگا خواہ یہ شرکت کسی نام اور کسی عنوان سے ہو۔

ذوالفقارِ حیدرِ کرّار

"ذوالفقار" شیرِ خدا حضرت علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کی اُس مشہورِ آفاق آسمانی تیغ کا لقب ہے جو جنگ اُحُد میں بارگاہِ الٰہی سے آپ کو عطا ہوئی تھی۔ "فَقَارَۃ" ریڑھ کی ہڈی کی گرہ کو کہتے ہیں اس کی جمع "فقار" آتی ہے چونکہ اس آسمانی تلوار کے طول میں ریڑھ کی ہڈی کی گرہوں کے سے اٹھارہ نشانات تھے اس وجہ سے اس کا لقب "ذوالفقار" شہرت پا گیا (مناقب ابن شہر آشوبؒ) عبد الملک اُصمعی مشہور عربی محقق نے اپنی رائے لکھی ہے کہ یہ نشانات اٹھارہ تھے اس کے پس منظر میں بعض دوسری روایات بھی بیان کی گئی ہیں لیکن اکثر و بیشتر محدّثین و مفسّرین اور سلسلۂ اہلِ بیتِ کرام علیہم السلام کے تمام راویوں نے بالاتفاق جس حقیقت کو نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ زمین کے لوہے سے بنی ہوئی تلوار نہ تھی بلکہ اس کو حضرت جبرئیل امین آسمان سے حضور سرورِ دو عالم کی خدمت میں لائے تھے۔

جنگ اُحُدؔ سے پہلے "ذوالفقار" کا کوئی خاص تذکرہ تاریخ میں نہیں ملتا اور نہ اسی کا پتہ چلتا ہے کہ اس کو اس سے قبل کسی مقام پر استعمال کیا گیا ہو۔

(حدید/۲۵) آیۂ کریمہ، وَاَنزَلنَا الحَدِیدَ فِیہِ بَاسٌ شَدِیدٌ الخ کی تفسیر سے متعلق بھی اہلِ بیت کرام سے راویوں نے جو احادیث نقل کی ہیں اُن سب میں یہی بتایا گیا ہے کہ اس "حَدِیدُ" یعنی "لوہے" سے جو آسمان سے نازل کیا گیا تھا۔ "ذوالفقار" ہی مراد ہے۔

یہ آسمانی تلوار سات بالشت لمبی اور ایک بالشت چوڑی تھی (تاریخ ابو یعقوب) مغربی مفکر مسٹر ہٹی نے اپنی تاریخ عرب میں لکھا ہے: حضرت علیؑ کی تلوار "ذوالفقار" جو پیغمبرؐ خدا نے آپ کو اُحُدؔ کی یادگار جنگ میں دی تھی۔ اس کی تعریف شاعروں نے اپنی نظموں میں بھی کی ہے جس سے وہ تلوار کبھی فنا نہیں ہو سکتی بلکہ اُس کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی اور بعد میں آنے والے بہت سے بہادروں اور نامور شجاعوں نے اپنی اپنی تلواروں پر یہ عبارت نقش کر لی تھی۔

"لَا سَیفَ اِلَّا ذُوالفَقَار وَلَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیؑ"۔ ذوالفقار کا کسی

دوسری تلوار سے اور علیؑ کا کسی اور بہادر اور جوان مرد سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

علی بن اسحٰق الزاہی شاعر کہتا ہے:۔

مَنْ هَزَمَ الْجَيْشَ يَوْمَ خَيْبَرَه
وَهَزَّ بَابَ الْقَمُوْصِ وَاقْتَلَعَه
مَنْ هَزَّ سَيْفَ الْإِلٰهِ بَيْنَكُمْ
سَيْفٌ مِّنَ النُّوْرِ ذُو الْعُلٰى طَبَعَه

علیؑ کے سوا کون ہے جس نے خیبر کی لڑائی میں کافروں کو شکست دی تھی اور قلعۂ قموص کے دروازے کو اکھاڑا تھا، وہ علیؑ ہی تھے جنہوں نے خدا کی تلوار کو تمہارے درمیان جنبش دی اس تیغ کی اللہ نے نور سے تخلیق فرمائی تھی۔

چونکہ یہ تلوار جبرئیل امین کی لائی ہوئی اور آسمان سے اُتری ہوئی تھی شاید اسی مناسبت کی وجہ سے خود فرشتۂ وحی نے میدانِ اُحد میں شیرِ خدا کی جنگ دیکھ کر سب سے پہلے آپ کی بہادری اور ذوالفقار کے جوہر کی مدح و تعریف میں ندا بلند کی تھی جسے مختلف صورتوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ محدثینِ اسلام نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ جب حضرتِ حیدرِ کرارؑ نے اس آسمانی

تیغ کے ساتھ کفار کے لشکر سے جنگ کر کے اُحُد کے میدان میں دشمن کا صفایا کر دیا اور اسلام کو فتح مُبین حاصل ہو گئی تو فلک سے ہاتفِ غیب کی یہ صدا سنی گئی: لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفِقَارِ وَ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّؑ (تاریخِ کامل، تاریخِ طبری، مدارِجُ النبوۃ) وغیرہ۔

اسی جنگِ اُحُد میں جنابِ علیؑ مرتضیٰ کی مدح میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے بشارتِ آسمانی کبھی سنی تھی:-

نَادِ عَلِیًّا مَظْهَرَ الْعَجَائِبِ. تَجِدْهُ عَوْنًا لَکَ فِی النَّوَائِبِ کُلُّ هَمٍّ وَغَمٍّ سَیَنْجَلِی، بِنُبُوَّتِکَ یَا مُحَمَّدُؐ وَبِوِلَایَتِکَ یَا عَلِیُّؑ یَا عَلِیُّؑ یَا عَلِیُّؑ

علیؑ کو آواز دو، حوادث اور مصائب میں تم اُن کو قوتِ بازو اور مددگار پاؤ گے، ہر رنج و غم عنقریب دور ہو جائے گا، اے محمدؐ آپکی نبوّت و رسالت کے ذریعہ سے اور اے علیؑ آپ کی وِلایت کے واسطہ سے۔ اس عبارت اور واقعہ کو محدّثین و علماء نے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے (فَوَاتِحِ مَیْبَذِی، مَدَارِجُ النُّبُوَّۃ، رَوْضَۃُ الصَّفَا، اِتحافِ اہل اسلام) اسلام کی تاریخی اور عظیم ترین لڑائیوں میں ذُو الْفِقَارِ شرر بار، غضبِ الٰہی اور قہرِ خداوندی بنکر کفر کے خرمنوں پر شعلے برساتی رہی اور ہمیشہ مسلمانوں کے سروں پر سایہ فگن رہی اسی تلوار کے ساتھ فرشتۂ شجاعت، شیرِ ذوالجلال حضرت

علیؑ نے اُحُدؔ و خندق و خیبر اور دوسرے تاریخی معرکوں میں کفر و اِلحاد کے شیطانی لشکروں کے خلاف نبرد آزمائی کی اور اسی تیغ سے آپ نے عمرو بن عبدِوُدّ اور مرحب و عنتر کے غرورِ شجاعت و مردانگی اور نشۂ اقتدار کو خاک میں ملا دیا۔

میدانِ اُحُد اور اس کے بعد ہر جنگ میں حضرت علیؑ نے ذوالفقار کو استعمال کیا تھا۔ آپ کی شہادت کے بعد یہ آسمانی تلوار حق و دیانت کی پکار پر ایک مرتبہ پھر کربلا کی آزمائشی جنگ میں یزیدی سامراجیت کے خلاف نکلی تھی اور تکمیل مقصدِ شہادت و بقائے اسلام کے بعد فتح و ظفر کا سورج بن کر نیام کے مغرب میں پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ابو محمد اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن سُدّی کوفی جو مجاہد، قتادہ، الکلبی، مُقاتِل اور شعبی کی ٹکر کے مفسر ہیں اور جنہیں علامہ ذہبی اور علامہ ابن حجر نے "صدوق" یعنی بے انتہا سچا لکھا ہے، اپنی مشہور تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ذوالفقار آسمانی تلوار ہے اور یہ سوائے نبیؐ یا وصیِ پیغمبر کے کسی دوسرے کے پاس کبھی نہیں رہی۔

تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ زخموں سے چور ہو کر حضرت پیغمبر اسلامؐ کی سواری کے

مشہور گھوڑے "مُرتجز" کی پشت پر سے زمین پر تشریف لا رہے تھے تو آپ نے اس عطیۂ خداوندی کو گھوڑے کی گردن کے قریب باندھ دیا تھا جسنے اس متبرک امانتِ رسالت و امامت کو خیامِ اہلبیتؑ پر واپس جا کر جو تھے وارثِ امامت حضرت زین العابدینؑ تک پہنچا دیا تھا۔

اس مقدس تلوار کا پہلا مظاہرہ میدانِ اُحد میں ہوا تو اسکی آخری رزمگاہ فرات کے کنارے کربلا کے ریگستان میں ہوئی مگر چونکہ حضرتِ سرورِ کائنات نے یہ عطیۂ الٰہی جناب شیرِ خداؑ ہی کے سپرد کیا تھا اس لیئے یہ صرف اُن ہی کی ذات کے لیئے مخصوص ہو گئی اور حضرت علیؑ ہی کے تبرک کی حیثیت سے اُن کے جانشینوں کے پاس رہی۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حضرتِ رسالتمآبؐ نے یہ مقدس اور نورانی تلوار شیرِ خداؑ کو جنگ اُحد میں اُس وقت عطا فرمائی تھی جب لڑتے لڑتے آپ کی تلوار ٹوٹ گئی تھی یہ دیکھتے ہی سرورِ عالم نے اُنھیں ذوالفقار دیدی۔

"اُحد" مدینہ سے بہت نزدیک ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے جس کے میدان میں یہ آزمائشی معرکہ ماہ شوال ۳ھ میں واقع

ہوا تھا۔

میدانِ جنگ موتہ کے فلک رسا شعلوں سے بھڑک رہا تھا، مسلمانوں کی خون آشام تیغوں کی دھاریں منکرینِ حق کے آشیانۂ زندگی کو خاکستر میں تبدیل کر رہی تھیں، مجاہدین اسلام کے طوفانی حملہ کی تاب نہ لا کر دشمن کے پیر اُکھڑ چکے تھے، اور ابوسفیان کا خونخوار لشکر اس تاریخی پسپائی کے بعد میدان سے فرار کر چکا تھا، مسلمانوں کو اطمینان تھا کہ اب دشمن کی کمر ٹوٹ چکی ہے اور اُس میں دوسری بار لڑنے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے۔ دشمن سے میدان کو صاف دیکھ کر کوہِ اُحد کے عقبی دَرّہ کے مسلمان محافظ سوائے ابن جبیرؓ اور اُن کے معدودے چند ساتھیوں کے سب کے سب چلے آئے۔ اس تنگ گھاٹی کی حفاظت کو کمزور دیکھ کر خالدؓ بن ولید مع عکرمہ بن ابی جہل لشکر کی ایک بھاری تعداد لیکر مسلمانوں پر انتہائی برق رفتاری سے بے خبری میں اور بالکل اچانک طریقہ پر حملہ آور ہوا (تاریخ ابن الوردی و تاریخ کامل ابن اثیر و صحیح بخاری باب المغازی)

دشمن کے اس شدید اور غیر متوقع حملہ نے لشکرِ اسلام میں افراتفری پیدا کردی اور ساری عسکری صفیں بکھر گئیں۔

گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ گہرے غبار کی چادر اور اس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک کا دوسرے کو پہچاننا بھی آسان کام نہ تھا۔ اس دار و گیر کے لرزہ خیز وقت میں حضرت پیغمبر اسلام کے پاس سوائے شیرِ خدا حضرت علیؑ کے کوئی باقی نہ رہا اور براویت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس عالم کارزار اور طوفانِ موت میں حضرت رسالتمآبؐ کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا اسی وقت آپ کی نظر حضرت علیؑ پر پڑی جو آپ کے پہلوئے مبارک میں کھڑے ہوئے تیروں اور تلواروں کو بارگاہِ رسالت سے دفع کر رہے تھے (مدارج النبوت) ذرا دیر میں دوسرے بہادر بھی شمعِ رسالت کے گرد جمع ہو گئے۔ ابو دجانہ انصاریؓ فرطِ ادب سے ڈھال کی طرح خم ہو کر حضرت سرورِ کائنات کا تیروں اور پتھروں سے بچاؤ کر رہے تھے اور اس طرح سارے تیر اور پتھر جو آنحضرتؐ کی طرف آتے تھے وہ ابو دجانہؓ پر پڑتے تھے۔ کفار کو جب رسول اللہ کے قیام کی جگہ کا علم ہو گیا تو اسی سمت اُن کے حملہ کا زور بھی بڑھ گیا۔ بقول علامہ شبلیؒ، دَل کا دَل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ (سیرۃ النبی ج ۱)

ابو دُجانہؓ اور سہل بن حُنیفؓ، حضرت رسالتمآبؐ کی حفاظت کرنے لگے اُدھر حضرت علی علیہ السلام ابوسفیان کے لشکر پر ٹوٹ پڑے اور اُن کی خون آشام تیغ نے دشمن کی صفوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

مُصعبؓ بن عُمیر پر عمرو بن قَمِیہ نے شدید وار کیا اور یہ بہادر خون میں لوٹنے لگا۔

مُصعبؓ کے زمین پر گرتے ہی ایک بہادر اور شیر دل مسلمان خاتون جو شمعِ رسالت کی پروانہ وار حفاظت میں شریک تھیں۔ اُمِّ عمارہ نَسِیبہ بنتِ کعب مازِنیہؓ نے تلوار اُٹھائی اور قاتل مُصعبؓ بن عُمیر پر شدید حملہ کیا اور پے در پے تلوار کی ضرب لگائی مگر چونکہ ابن قَمِیہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لیئے اس پر تلوار کا اثر نہ ہوا لیکن خود اس کی تلوار سے اُمِّ عُمارہ کا بازو بُری طرح زخمی ہو گیا۔ جنگ اُحُد میں ابوسفیان کے لشکر کی تعداد پانچ ہزار تک بتائی جاتی ہے جس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا لشکر صرف سات سو افراد پر مشتمل تھا اس قیامت خیز لڑائی میں عُتبہ بن ابی وَقّاص اور عمرو بن قَمِیہ کی سنگ باری سے سرورِ کائنات کے چہرۂ مبارک پر شدید زخم آیا اور بعض راویوں نے یہاں تک بھی لکھا ہے کہ دندان مبارک شہید ہو گئے لیکن کم از کم

اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ آپ کے دندانِ مبارک اور چہرہ پر کاری زخم پہنچا تھا۔ رسول اللہؐ کے زخمی ہونے کی خبر جب مدینہ میں پہنچی تو آپکی عزیز ترین بیٹی حضرت سیّدۂ عالم فاطمہ زہراؑ بنی ہاشم کی ۱۴ عورتوں کے ہمراہ انتہائی پردہ داری کے ساتھ خیمۂ رسولؐ میں گئیں اور اپنے محبوب پدر کی خدمت میں حاضر ہو کر چہرۂ رسولؐ کو خون سے صاف کیا اور حضرت علیؑ پانی ڈالتے رہے۔ اسی جنگ اُحد میں عمّ رسولؐ حضرت حمزہؓ بن عبدُ المطلب بھی وحشی نام کے ایک غلام کے حملہ سے شہید ہوئے تھے جو اُس نے آپ پر کمینگاہ میں چھپ کر کیا تھا۔ پیغمبرِ اسلام نے زخموں کی شدّت کے باوجود کسی کے لئے بد دعا نہیں فرمائی اور جب آپ کو کوئی زخم لگتا تھا تو فرماتے تھے: رَبِّ اغۡفِرۡ قَوۡمِیۡ فَاِنَّہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔" اے میرے اللہ میری قوم کو بخش دے یہ معرفت نہیں رکھتے۔ بعض محترم خواتینِ اسلام نے بھی اس جنگ میں زخمیوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دی تھی اور اُمِّ عمارہ نے تلوار سے بھی جنگ کر کے پیغمبرؐ کی حفاظت میں شرکت کا شرف بھی حاصل کر لیا۔ غرض یہی کارزارِ اُحُد کا آزمائشی موقع تھا جسکی ابتداء میں لڑتے ہوئے حضرت شیرِ خدا حیدرِ صفدرؑ کی تلوار ٹوٹ گئی تھی، یہ دیکھتے ہی سرورِ دو عالم نے آپ کو "ذُوالفقار" آسمانی عطا کی جس سے

آپ ہمیشہ کفر و شرک کے خلاف جنگ کرتے۔ ہے یہ ذُوالفقار بھی اُسی آسمانی اور الٰہی نصرت کی ایک کڑی تھی جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے (سورۃ المؤمن ۵۱/۴۰) ترجمہ "ہم یقیناً اپنے پیغمبروں اور تمام صاحبان ایمان کی مدد کریں گے، اس دُنیا کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد قیامت کے دن بھی جب گواہ شہادت دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے" یہ غیبی مدد ہمیشہ مردانِ حق و دیانت کو اللہ کی طرف سے حاصل ہوئی ہے اور تاریخ ہر دور میں اس آسمانی نصرت کے ثبوت پائے جاتے ہیں۔ اَبرَھَہ اَشرَم شاہِ یمن نے جب کعبہ طیبہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس کام کے لئے ہاتھیوں کا ایک عظیم لشکر لیکر مکہ پر چڑھائی کی تھی تو اسی غیبی امداد نے اس کافر کے خواب کو خوابِ پریشاں بنا دیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے طائروں کے ایک بڑے جھنڈ نے فضا سے پتھر کے ننھے ٹکڑوں کو اس کے لشکر پر برسا دیا جو وہ پرندے اپنے پنجوں میں لیکر آئے تھے۔ جس سپاہی پر کوئی کنکری گرتی تھی تو وہ وہیں پر ٹھنڈا ہو جاتا تھا اور بالآخر پرندوں کی اس ننھی سی فوج نے ان قدرتی چھوٹے چھوٹے ایٹم بموں سے ابرھہ کے حیوانی ٹینکوں (ہاتھیوں) کے عظیم لشکر کو ذرا سی دیر میں تہس نہس کر ڈالا۔

جنگِ بدر[۱] میں بھی غیبی امداد کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: ترجمہ "تمہارا پروردگار ایسے پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا جو نشان جنگ لگائے ہوئے ہوں گے" خندق[۲] اور حنین میں بھی غیبی مدد آئی تھی۔ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا "اللہ نے ایسے لشکر بھیج دیئے جنہیں تم دیکھتے بھی نہ تھے" شبِ ہجرت جب رسولؐ اللہ دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اُس وقت بھی غیبی امداد آپ کے شامل حال تھی اور یہ ارشاد ہوا تھا (ترجمہ) خدا نے اپنے رسولؐ کی ایسے لشکروں[۳] سے نصرت فرمائی جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل تھے" (توبہ/۴۰)

اُحدؓ کے معرکہ میں بھی حضرت حیدرِ کرار کے ساتھ کفار سے جنگ کرتے ہوئے ایسے سپاہی دیکھے گئے جو سفید لباس میں ملبوس تھے اور اُنھیں اس سے قبل کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔ خدا بیشک مردانِ حق کی نصرت فرماتا ہے اور ہر مصیبت اور آزمائش میں اُن کی غیب سے مدد ہوتی ہے بشرطیکہ اُن کے قدم صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور اُن کی ایمانی طاقت میں کمزوری نہ پیدا ہونے پائے۔

عہ آلِ عمران/۱۲۵ - عہ احزاب/۹ - عہ توبہ ۲۵/۲۶

قمار بازی

ایک سچے مسلمان کے لئے احکام اسلام کا پابند ہونا اور خدا و رسولؐ کے ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب تک اس کا عمل درست نہ ہوگا اور کردار اسلامی کردار نہ ہوگا۔ اُس وقت تک اُس کو اس بات کا حق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے کو سچا مسلمان سمجھے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

"اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ"

کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کا امتحان نہ لیا جائے گا۔ (عنکبوت) آیہ ۲

پھر فرمایا ہے: اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ۔ (عنکبوت ۴)

کیا جو لوگ بُرے عمل کرتے ہیں انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچکر نکل جائیں گے۔ یہ لوگ کیا بُرا حکم لگایا کرتے

ہیں۔

دوسرے مقام پر خدا کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ " (انعام ۱۶۵)

"اللہ ہی نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا ہے اور تم میں سے بعض کے درجے بلند کئے ہیں تاکہ جو نعمتیں اُس نے تم کو دی ہیں اُن میں تمہارا امتحان لے"

جن باتوں سے انسان کو اسلام نے بچنے کی ہدایت کی ہے اُن میں سے ایک بڑا گناہ قمار بازی بھی ہے سورۂ مائدہ میں اللہ فرماتا ہے :۔ (آیہ/۹۰-۹۲)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ "۔

اے ایمان والو! شراب، جوا، بُت اور پانسے ناپاک اور

شیطانی کام ہیں۔ تم لوگ ان سے بچے رہو تاکہ تمہیں فلاح اور کامیابی ہو۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کی بدولت تم میں باہم عداوت اور دشمنی پیدا کر دے اور تم کو خدا کی یاد اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم شیطان کے راستے پر چلنے سے اور ان برے افعال سے باز آنے والے ہو؟ خدا اور رسول کے احکام پر عمل کرو اور ان کی اطاعت کرو اور اُن کی نافرمانی سے بچو لیکن اگر تم نے خدا و رسول کے حکم سے روگردانی کی اور اس پر عمل نہ کیا تو یاد رکھنا کہ ہمارے رسول کا کام بس اتنا ہی ہے کہ وہ صاف صاف پیغام پہنچا دے۔" وہ سچا مسلمان ہرگز نہیں ہو سکتا جو خدا اور رسول کا خوف نہ رکھتا ہو اور جس کا ایمان جزا و سزا پر نہ ہو جو روز حساب کو بھولا ہوا ہو اور جو اللہ کو سمیع و بصیر نہ جانتا ہو۔ انسانی معاشرہ کو جوے کی لعنت نے جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ہزاروں خاندان اس بری عادت اور شیطانی عمل کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے اور لاتعداد بیگناہ جانیں ضائع ہو گئیں محض اس لئے کہ صحیح راستہ جو خدا نے بنایا تھا وہ چھوڑ کر شیطان کی تعلیم پر انسان نے عمل کیا اور تباہی کے غار میں گر گیا۔ قرآنِ کریم کا اعلان

صاف ہے جس میں جوئے کو شراب خوری بُت پرستی اور اَزلام کی طرح عملِ بد اور نجاستِ شیطانی فرمایا گیا ہے اور اس سے اجتناب کرنے کا حکم ہے اور کھلے ہوئے الفاظ میں حکم دیا گیا ہے کہ یہ افعال حکم خدا و رسولؐ کے خلاف ہیں اور ان کا مرتکب خدا کے نزدیک مُجرم ہے اور عذاب الٰہی کا مستحق ہے۔

کیا اس شدید دھمکی کے بعد بھی کسی سچّے مسلمان میں یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ قِمار بازی کے قریب جا سکے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا و رسولؐ سے محبّت کرنے والا مُسلمان قِمار بازی کرکے خدا کے عذاب کا اور رسولؐ کے غضب کا استحقاق پیدا کر لے۔ قرآنِ حکیم نے قِمار بازی کے لئے لفظ مَیسِر ارشاد فرمایا ہے جس سے مراد ہر قسم کا جُوا ہے۔ ابنِ عبّاسؓ اور قتادہؓ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیروں میں لکھا ہوا ہے: کُلُّ شَیٍٔ فِیہِ قِمَارٌ مِن نَردٍ اَو شِطرَنج اَو غَیرِھِمَا فَھُوَ المَیسِرُ۔ ہر وہ چیز جس میں جُوا ہو اور شرط بدی جائے جیسے چوسر اور شطرنج یا اسی طرح کی دوسری چیزیں یہ سب مَیسِر ہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

یَقُولُ تَعَالٰی نَاھِیاً عِبَادَہُ المُؤمِنِینَ عَن تَعَاطِی الخَمرِ وَالمَیسِرِ وَھُوَ القِمَارُ۔ یعنی اس آیت کے ذریعہ سے خدا نے اپنے بندوں کو

خمر و میسر سے منع فرمایا ہے اور میسر سے مراد جوا ہے۔

علامہ ابن کثیر اس کے بعد لکھتے ہیں: وَقَدْ وَرَدَ عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ اَلشِّطْرَنْجُ مِنَ الْمَیْسِرِ۔ یعنی حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ شطرنج بھی میسر ہی میں داخل ہے۔

اس لیے چوسر، چکیسی، شطرنج یا کسی قسم کا ہار جیت کا کھیل جو شرط بد کر کھیلا جائے، وہ سب جوا اور قمار ہے، اور میسر کے حکم میں داخل ہے اور قطعاً حرام ہے نیز ان اعمال کا کرنے والا عذاب خداوندی اور غضب رسولؐ کا مستحق ہے۔ خدا نے جس قدر بھی احکام مقرر فرمائے ہیں ان کی بنا حکمت و مصلحت پر ہے اور ان تمام احکام پر عمل کرنے میں ہمارا ہی فائدہ ہے اور عمل نہ کرنے میں ہمارا ہی نقصان ہے۔

اسلام سے پیشتر ان اعمال قبیحہ کا بہت رواج تھا مگر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان تمام اعمال بد سے مسلمانوں کو منع فرما دیا۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شطرنج یا چوسر کھیلے گا گویا اس نے اپنا ہاتھ سور کے گوشت میں ڈال دیا اور اس کے خون میں ڈبو دیا

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے سنا کہ جنابِ رسول
خدا فرماتے تھے: جو چوسر کھیل کر نماز پڑھنے کھڑا ہو اسکی مثال ایسی
ہے جیسے کوئی پیپ اور خنزیر کے خون سے وضو کر کے نماز پڑھنے
کھڑا ہو۔ شطرنج، چوسر اور دوسری قمار بازیوں کی حرمت پر تمام
مسلمانوں کا اجماع ہے اور تمام ائمہؑ احادیث نے بالاتفاق جوئے
کی ہر قسم کی حرمت کو بیان کیا ہے۔ عام اس سے کہ ان میں پانسے
استعمال کئے جائیں یا کسی دوسری طرح جوا کھیلا جائے یا اسے
کاروبار کی حیثیت سے عمل میں لایا جائے۔ قمار کی کسی شکل میں یہ
ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو ظاہری طور پر اس کا کبھی کچھ فائدہ نظر
آجائے مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ فائدہ اس کے لیئے اور پوری
بنی نوعِ انسان کے لیئے سمِ قاتل ہے۔ کوئی شخص اگر کسی کو بے
گناہ قتل کر دیتا ہے، یا کسی کا مال لوٹ لیتا ہے تو چور اور قاتل
کو ظاہر میں کچھ فائدہ پہنچتا ہے لیکن کیا ان کا یہ عمل اس انفرادی
نفع کی وجہ سے جائز ہو سکتا ہے؟ نفع حقیقت میں صرف وہی ہے
جس میں تمام نوعِ بشر کا فائدہ ہو۔ اگر ایک شخص کے فائدہ سے
دوسرے شخص کی یا ایک خاندان کی زندگی تباہی میں مبتلا ہو رہی ہو
تو وہ فائدہ نہیں ہے بلکہ عذاب کی ایک شکل ہے اور تباہی و

بربادی کا ایک خوبصورت پردہ ہے جس کے اندر ہلاکت اور تباہی وبربادی کی بھیانک تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔

اسی لیئے سورۂ بقرہ ۲۱۹ میں ارشاد ہوا ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا:

اے رسول تم سے شراب اور جوے کے متعلق لوگ دریافت کرتے ہیں اُن کے جواب میں کہدو کہ ان چیزوں میں بڑا گناہ ہے یعنی یہ ہر برائی کی جڑ ہیں، اور اِن میں لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں مگر اِن کا گناہ ان کے فائدہ سے بہت زیادہ ہے" پھر اس گناہ کی شدت کو دوسری آیت میں ظاہر فرمایا جس کا ابھی میں نے ذکر کیا تھا۔ کہ یہ سب خبیث اعمال شیطان کی نجاست ہیں اور ان سے بچنا ہر مسلمان کے لیئے واجب ولازم ہے اور اگر کوئی ان احکام سے روگردانی کرے گا تو وہ عذاب خدا کا مستحق ہوگا۔ قمار بازی نے جن افراد اور خاندانوں کو تباہی کے غار میں ڈالا ہے اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔ اِس عمل بد سے جائدادیں الگ مٹی ہیں اور جانیں الگ ضائع ہوئی ہیں جن کا کوئی حساب نہیں کیا جاسکتا۔ محض موہوم فائدہ کی بنا پر اپنے اور اپنے بچوں

اور پورے معاشرے کے لئے تباہی کے اسباب پیدا کرنا انسان کے حق میں کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ اسلام صرف اُن ہی باتو کی اجازت دیتا ہے جن میں تمام معاشرہ کی بھلائی اور پوری نوعِ بشر کا فائدہ مُضمر ہو۔ اُس نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ انسان اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈال دے :-

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (لبقرۃ ۱۹۵)

تم اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرو"

اُس نے ہر شخص کو یہی حکم دیا ہے کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا تحفّظ کرے اور اُن کی ہلاکت و بربادی کا سبب نہ بنے :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (تحریم ۶)

اے ایماندارو اپنے نفسوں کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے محفوظ رکھو اور اُن کی اور اپنی ہلاکت کا سبب نہ بنو"

ایک حدیث میں ہے کہ جب آیۂ تحریم شراب و قمار نازل ہوئی تو لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ مَیْسِر سے کیا مراد ہے ؟ آپ نے فرمایا : کُلُّ مَا تُقُوْمِرَ بِہٖ۔"

حضور اکرم نے انھیں جواب دیا کہ ہر وہ عمل جس میں شرط بدی جائے وہ مَیْسِر اور قِمار ہے۔

قرآن کریم نے جوے کی حرمت کا ذکر شراب اور بت پرستی کے ساتھ کیا ہے جس سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے کہ جوے کی حیثیت اسلام کی نظر میں بت پرستی سے کم نہیں ہے اور جس طرح بت پرستی کفر و شرک ہے اسی طرح جوا بھی معنوی حیثیت سے ایمان و اسلام کی روح کو ہلاک کرنے والا ہے اور یاد الٰہی سے غافل بنا دیتا ہے، اس لیے اس کی حرمت کسی بیرونی سبب پر موقوف نہیں رکھی گئی بلکہ بُت پرستی اور شراب کی طرح اس عمل کو بھی رجس و نجاستِ شیطانی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ انفرادی گناہ نہیں ہے بلکہ اس کی تباہ کاریاں پورے انسانی معاشرہ کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

ایک طرف جس کو کچھ فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ کامیابی کے نشہ میں خدا کو بھول جاتا ہے اور دوسرے شخص کی تکلیف اور مصیبت کا اُسے کچھ بھی احساس نہیں ہوتا جس کے خون سے اس نے اپنے ہاتھ رنگین کیئے ہیں اور جس کی پونجی تباہ ہوئی ہے اُس پر کیا گذرتی ہوگی۔ اس خبیث عادت کی وجہ سے ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی لالچ طبیعت میں پیدا ہوتی ہے دوسرے کو زک دینے کی اور اس کو نقصان پہنچانے کی طمع رہا کرتی ہے

اور اُن انسانی قدروں کو ٹھیس لگتی ہے جو نوعِ بشر کی زندگی کا امتیاز ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرح کی کمائی ہوئی، دولت کی ایک پائی پر بھی تصرّف کرنا اُس کے اصلی مالک کے علاوہ کسی شخص کے لیئے بھی جائز نہیں ہے۔ نہ تو ایسی دولت کو اپنے مصرف میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کے مصرف میں بلکہ یہ اصلی مالک کا مال ہے۔ نہ یہ غصبی مال نہ زکوٰۃ وخمس نکالنے سے پاک ہوسکتا ہے اور نہ زکوٰۃ وخمس نکالنا اس میں جائز ہے۔ کیونکہ یہ مال اُس کی ملکیت ہی نہیں ہے جس کو یہ قمار بازی کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔

ایسے لوگ جو جُوے میں مبتلا رہتے ہیں اُن کے دلوں میں بنی نوعِ انسان کے لیئے کوئی رحم نہیں رہتا اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو دولت کی حرص بڑھتی ہے اور فراوانیٔ ثروت کے مہلک نتائج کا شکار ہوتے ہیں اور اگر ناکامیاب ہوتے ہیں تو خود بھی تباہ ہوتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ بہت سے بے گناہ انسانوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں اور پھر اُن میں انتقام کی آگ بھی بھڑکتی ہے جس سے پورے معاشرے میں بد نظمی پھیلتی ہے اور اسی رسّہ کشی اور کشمکش کی وجہ سے ان میں سے

کسی کو اللہ یاد نہیں آتا، یہ ظلم کے خوگر ہو جاتے ہیں، ان میں عیاشی کے جذبات ابھرتے ہیں، ان میں خونریزیاں ہوتی ہیں، ان میں باہم مقدمہ بازیاں ہو کر ہزاروں قسم کی تباہیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیئے اسلام نے قمار بازی کو حرام کیا ہے تاکہ انسانی معاشرہ کا ہر فرد چین اور امن کی زندگی بسر کرے اور ہر انسان کو آزادی امن و انصاف کے ساتھ جائز ذرائع سے اقتصادی ترقی کرنے کا حق ملے جو اُس کی عزت اور زندگی کے آزادانہ نشوو ارتقا کے لیئے ضروری ہے۔

غور و فکر

اسلام ہی تنہا وہ دین ہے جس کے تمام اصول اور تمام تعلیمات کی بنیاد تعقّل اور تفکّر پر ہے اسی نے انسان کو پہلی بار اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اُس کو اللہ نے تمام کائنات پر فضیلت عطا کی ہے اور اس فضیلت و شرف کا بہت بڑا سبب وہ غور و فکر کی صلاحیت اور جوہر عقل ہے جو اُس کی فطرت کو بخشا گیا ہے۔ قرآن و حدیث میں کثرت کے ساتھ تفکّر کی دعوتِ عام دی گئی ہے اور اس کو بہترین عبادت کا درجہ ملا ہے۔ اس غور و فکر کی صلاحیّت کا سب سے پہلا تعلق اس بات سے ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرے اور پھر اُس کی مرضی اور مشیّت کو سمجھنے کی کوشش کرے تاکہ وہ اُس عظیم مقصد کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے جس کے لیئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

اللہ کے اس کلام نے انسان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھا دیئے ہیں اور وہ انسان جو بدترین قسم کی خصلتوں

میں مبتلا تھا، اور گمراہیوں اور جہالت کا شکار تھا اور جو احساسِ کمتری کا ایک ذلیل اور حقیر مجسمہ بنا ہوا تھا۔ اس نئے شعور، جدید احساس اور انسانی زندگی کے ایک نئے رُخ سے روشناس ہو گیا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (سورۂ اسرآء) ہم نے یقیناً آدمؑ کی اولاد کو عزت دی ہے اور ہم نے انھیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے ہی انھیں اچھا رزق عطا کیا اور انھیں اپنی کثیر مخلوق پہ پوری برتری دی"۔ اللہ کے اس اعلان نے بتا دیا کہ انسان کی تخلیق تمام کائنات میں وہ مقام رکھتی ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ اُسے یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ پوری کائنات اُسی کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس پہ اُس کو کامل اقتدار بھی دیا گیا ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمٰن) کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اللہ نے تمہارا تابع کر دیا ہے اور تم پہ اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ اس طرح انسان

کے لیئے غور و فکر کی راہیں کھول دی گئیں اور وہ یہ سمجھنے کے قابل بن سکا کہ یہ چیزیں جنکی میں پرستش کر رہا تھا یہ سب میری خدمت گذار ہیں اور اس لیئے مجھے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کے اندر وہ کون سے پہلو موجود ہیں جو میری زندگی کے لیئے کسی طرح بھی نفع اور فائدہ کا سبب ہو سکتے ہیں۔ جب تک کائنات اس کی مخدوم سمجھی گئی اور اسے انسان کے معبود کا درجہ ملا رہا ظاہر ہے کہ اس کی خلقت اور اس کے وجود میں فکر و نظر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر جب اسلام نے اس کو اس حقیقت سے روشناس کیا کہ وہ کائنات کا خادم نہیں بلکہ مخدوم ہے اور بندہ یا غلام نہیں بلکہ اس کا سردار اور آقا ہے تو اب تعقّل و تفکر کی راہ کھلی اور بار بار اس بات کو سمجھنے کی ضرورت پڑی کہ اس کائنات کے راز کیا ہیں اور ان سے انسانی زندگی کی قدریں اور اس کے تقاضے کس طرح پورے کیئے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے طرح طرح سے اس غور و فکر اور تعقّل و تفکّر کے جذبہ کو بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کتاب اللہ کا کوئی حصّہ ایسا نہیں ہے جو فکر و نظر کی دعوت اور تدبّر و تعقّل سے

مطالبہ سے خالی ہو۔

قرآن نے انسان کو دو طرح کی فکر کی طرف دعوت دی ہے یعنی جہاں اُس نے یہ کہا ہے کہ وہ کائنات اور خود اپنے وجود سے باہر کی چیزوں پر غور کرے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ خود اپنے وجود پر بھی غور و فکر کرے تا کہ اُسے کائنات کے اندر اپنا مقام بھی معلوم ہو سکے اور وہ نسبت اور رشتہ بھی معلوم ہو جائے جو اُس کے اور کائنات کے درمیان ہے۔ سورہ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد خداوندی ہے: (آیہ ۵۳)

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط۔

ہم عنقریب ہی اُنھیں اپنی قدرت کی نشانیاں اطراف عالم میں اور خود اُن کے نفسوں میں بھی دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر یہ ظاہر ہو جائے کہ یہی حق ہے۔ آفاقی آیتوں سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کا تعلق طبیعیات، عنصریات اور فلکیات سے ہے اور "انفس" سے مراد نفس بشری کے اسرار اور بھید ہیں۔ اِس طرح اللہ نے انسان کو غور و فکر کی ایک انتہائی وسیع بنیاد عطا فرما دی ہے اور اُس پر کائنات کے ذرہ ذرہ کو سمجھنے کے لیے ہر ممکن راستہ کھول دیا گیا ہے۔

اس سے پوری طرح ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کو تمام مخلوقاتِ عالم پر کتنا بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس میں فکر کی وہ صلاحیتیں موجود ہیں جو آفاق و انفس کے ہر رخ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ پھر قرآن حکیم میں بدلے ہوئے عنوان سے اسی بات کو یوں بھی فرمایا گیا ہے۔ (آیہ ۲۰/۲۱)

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

(سورۃ الذاریات) اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں قدرت کی نشانیاں ہیں اور خود تم میں بھی ہیں تو کیا تم نہیں دیکھتے" پھر دوسری جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان کو چونکہ غور و فکر کی صلاحیت دی گئی ہے اس لئے اس کے صحیح طور پر استعمال سے متعلق اس کو خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہونا پڑیگا۔ (آیہ /۳۶)

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (سورۃ اسراء) بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی پوچھ گچھ ہوگی۔

یہی قوت فکر و تدبر وہ عہدِ الٰہی ہے جسکا جا بجا قرآنِ حکیم نے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس عہد کو پورا کرنا ایمان ہے اور اسے توڑنا اور اس کی خلاف ورزی کرنا کفر ہے یا دوسرے

لفظوں میں اس صلاحیت فکر و تدبر کو صحیح طریقہ پر استعمال کر کے رموز ہستی سے آگاہی حاصل کرنا ایمان ہے اور اس نعمت کو ٹھکرا دینا اور اس کے تقاضوں کو پورا نہ کرنا کفر ہے۔ غرض اسلام نے بنی نوعِ انسان کو غور و فکر کی دعوت اتنی شدّت کے ساتھ دی ہے جس کی کوئی دوسری مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ سورۂ روم میں اللہ کا یہ ارشاد :- (آیہ/۸)

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى "کیا ان لوگوں نے اس بات پر اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے سارے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں اُن کے درمیان ہیں بالکل درست ۱۹۱ اور مقرر میعاد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ آل عمران میں ہے : وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اہل ایمان کی صفت یہ ہے، کہ وہ آسمان و زمین کی پیدائش پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک تفکر و تدبر کا جو مرتبہ ہے جس کا اندازہ سرورِ کائنات کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہو سکتا ہے : مَنْ لَا عَقْلَ لَهٗ لَا دِيْنَ لَهٗ، جس شخص کے پاس عقل نہیں ہے، یعنی جو

عقلِ سلیم سے کام نہیں لیتا اُس کا کوئی دین ہی نہیں ہے ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ لَاعِبَادَۃَ کَالتَّفَکُّرِ فِیْ صَنْعَۃِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔ "اللہ کی صنعت وقدرت میں غور کرنے سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے یعنی اگرچہ اپنی جگہ ہر عبادت ضروری اور لازمی ہے اور اُس کا ایک خاص مقام ہے مگر تفکر و تدبّر کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اس طرح اسلام نے نہ صرف یہ کہ انسان کو صحیح اور معتدل اجتہادِ فکری کی دعوت بہم دیکر اُس کی لامحدود ارتقائی رعنائیوں کو اُبھارا ہے اور کائنات کی وسیع تر پہنائیوں تک پہنچنے اور اُن کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنے کی راہ میں اس کے لیئے ہر بندش کو توڑ دیا ہے بلکہ اسے دین میں شامل کر کے عبادت کا درجہ بھی عطا کیا۔

پھر پوری کائنات کچھ حقیقتوں کا مجموعہ ہے جن میں ہم کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے اور ہمیں اُن کو اسی طرح سمجھنا پڑے گا جس طرح وہ ہیں دوسری طرف ہماری شعوری صلاحیتیں بھی اور ہماری فکری قوتیں بھی اپنے مقام پر ثابت و مقرّر ہیں اور ہمیں اس پر پورا اقتدار بھی دیا گیا ہے کہ ہم انھیں کام میں لا سکیں اور درحقیقت یہ شعوری اور فکری صلاحیتیں بھی کائنات کی

ناقابل تبدیلی حقیقتوں ہی میں داخل ہیں۔ بہرحال یہ دونوں سرے اور دونوں مرکز اور کنارے معین و مقرر ہیں اور ان کو ہم ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے لیکن یہ پوری طرح ممکن ہے کہ اپنی ان صلاحیتوں سے ہم بے خبر ہوں یا انھیں جانتے ہوں اور ان سے کام نہ لیں یا کام بھی لیں اور صحیح طریقہ پر کام نہ لیں۔

قرآن مجید نے ہمیں یہاں ہر قدم پر سہارا دیا ہے اور یہ اسکا عظیم احسان ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کائنات بے مقصد نہیں بلکہ با مقصد ہے، اُس نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ اس کی تخلیق کا مقصد انسان ہی کا نفع ہے، اور یہ سب کچھ اُسی کے فائدہ کیلئے بنایا گیا ہے، اس نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ انسان تخلیق کے اعتبار سے ہر مخلوق سے بلند و برتر ہے۔ اسلئے انسان کو بھی باخبر کر دیا ہے کہ اُس کی فطرت میں فکر و نظر کی عظیم ترین قوتیں، صلاحیتیں اور رعنائیاں پنہاں ہیں۔ ان تمام کائناتی ادوار اور عالمی حقائق سے آگاہ کرنے کے ساتھ ہی اسلام کا ایک عظیم احسان فطرت انسان پر یہ ہے کہ اُس نے انسان کو اسکی بھی تعلیم دی ہے کہ وہ ان عالمی ادوار کو فکر و نظر کے کن زاویوں سے دیکھے اور ان زاویوں میں جو غلطیاں ممکن ہو سکتی ہیں اُنھیں کس طرح دور

کیا جائے اور وہ کون سے بنیادی اصول ہیں جن سے ان فکری زاویوں کو انتہائی درست طریقہ پر کام میں لایا جا سکتا ہے اور پھر اسی استعمال کے طریقہ پر ایمان و کفر اور جزا و سزا کا تعیّن ہوا کرتا ہے۔

(۱) "فکر" اس قوّت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے۔

(۲) "تفکّر" کے معنی ہیں عقل کے تقاضوں کے مطابق اسی قوّتِ فکر سے کام لینا۔

یہ قُوّت صرف انسان کو ملی ہے، حیوانات اس سے محروم ہیں۔ پھر فکر کے کچھ راستے بھی مقرر ہیں مثلاً یہ کہ انسان کو صرف کائنات کے اندر ہی غور و فکر کا حق حاصل ہے نہ کہ خالقِ کائنات کی ذات میں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ "تفکّرُوا فی آلاءِ اللّٰہِ ولا تفکّروا فی اللّٰہِ" اس طرح کائنات میں انسان جس قدر بھی تفکّر کرے کر سکتا ہے اس کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو چیزیں اُس کے لیئے خلق ہوئی ہیں یعنی کائناتِ عالم انھیں میں اُسے غور و خوض کرنے کا حق حاصل ہے اور جو ہستی خود اُسکی خالق ہے اُس کی ذات کو

سمجھنا اس کی طاقت اور شعوری صلاحیت سے باہر ہے اس کو سمجھنے کا نہ اس کے پاس کوئی ذریعہ ہے اور نہ اس میں اس کی طاقت ہی ہے اس لیئے اس راستہ پر اس کا ہر قدم جواب دیدے گا اور قطعی طور پر وہ قدم قدم پر بھٹکنے لگے گا اسی طرح جیسے کسی نئے راستہ پر کوئی آنکھوں والا رات کے اندھیرے میں یا دن کی روشنی میں کوئی اندھا بے مقصد طریقہ پر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔

(مقصد فکر) فکر کا مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کو اجمالی حیثیت سے پہچانے اور اس کی مشیت سمجھے اور اپنے مقصدِ تخلیق کو معلوم کرے اور خدا کی نعمتوں کو پہچان کر ان سے فائدہ اٹھائے تاکہ نقصان اور گھاٹے سے محفوظ رہ سکے نیز تباہی و بربادی سے بچ سکے، ارتقائی منزلیں طے کر کے اپنے جائز مقام پر پہنچ سکے اور اپنے اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔

جانِ وفا حضرت عباسؑ علمدار

حضرت ابوالفضل العباسؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نامور، وفادار چھوٹے بھائی تھے۔ آپ ہجرتِ رسولؐ کے چھبیسویں ۲۶ سال پیدا ہوئے تھے۔ والدۂ گرامی اُمّ البنینؓ تھیں جنکا اصلی نام فاطمہ بنتِ حزام کلابیہ تھا۔ یہ معظمہ اُس بہادر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جس کی شجاعت و بہادری کو عرب کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ بنتِ رسولؐ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کے بعد ایک موقع پر حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت عقیلؓ سے فرمایا کہ آپ عرب نسلوں اور خاندانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ بہادر خاندان کا پتہ بتایئے جہاں میں عقد کروں تاکہ میرے گھر میں ایک اور بہادر فرزند پیدا ہو اور وہ معرکۂ کربلاء کے موقع پر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ حضرت عقیلؓ نے ان ہی اُمّ البنینؓ کا نام لیا اور عرض کی کہ ان کے خاندان سے زیادہ پورے عرب میں کسی خاندان کی بہادری شہرت نہیں رکھتی

ان کے قبیلہ کی ایک مشہور شخصیت "ابو براء" تھے جنہیں "مُلاعِبُ الاَسِنَّۃ" یعنی نیزوں کے پھلوں سے کھیلنے والا کہا جاتا تھا جن کی شجاعت کی نظیر پورے جزیرہ نمائے عرب میں موجود نہ تھی ان ہی کے خاندان میں طُفَیل بن مالک تھا جو فارسِ قُرزُل کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ قُرزُل اور مُزلُوق دو مشہور اور سرکش گھوڑے تھے جن کے شہسوار ہونے کی نسبت سے یہ لوگ شہرت رکھتے تھے۔ یہ سن کر حضرت علیؑ نے اس عظیم اور نامور خاتون کے ساتھ عقد کا پیغام بھیجا تھا۔ ان ہی کے بطنِ مبارک سے قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباسؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ اسقدر حسین جمیل تھے کہ لوگ آپ کو خاندانِ ہاشم کا چاند کہکر خطاب کرتے تھے۔ حضرت امیرؑ کی شہادت کے وقت آپ کی عمر چودہ ۱۴ برس کی تھی۔ بہت سی لڑائیوں میں حضرت عباسؑ اپنے عظیم باپ کے ساتھ شریک ہوئے لیکن حضرت علیؑ نے اپنے کمسن فرزند کو جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ معرکہ کربلا میں حضرت عباسؑ کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔ صاحب "اِبصارُ العَین" لکھتے ہیں۔ "وَکَانَ عَلَیہِ السَّلَامُ اَیدًا اَشجَاعًا فَارِسًا وَسِیمًا جَسِیمًا یَرکَبُ الفَرَسَ المُطَهَّمَ وَرِجلَاهُ تَخُطَّانِ فِی الاَرضِ" حضرت عباسؑ علمدار بڑے شہسوار

تھے اور بے حد بہادر۔ وہ ہمیشہ بلند قد اور انتہائی خوبصورت گھوڑے پر سوار ہوا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ کے دونوں پیر زمین تک پہنچ جاتے تھے اور اس پر نشان بنتے رہتے تھے۔ حضرت قمر بنی ہاشم کی بہادری اور اسکی اہمیت کا اس واقعہ سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت زہیرؓ بن قینؒ اس مرتبہ شجاعت کے باوجود جو انھیں قبائل عرب میں حاصل تھا اور کچھ ایسے ہی بہادر تھے کہ امام حسینؑ نے کربلا میں اپنی منتخب روزگار سپاہ بہادر فوج کے میمنہ کا انہیں امیر بنایا تھا مگر زہیرؓ کی نگاہیں بھی حضرت عباسؑ ہی کی تلوار کے جوہر دیکھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ عاشور کے دن گھمسان کی لڑائی میں ایک خاص موقع پر زہیرؓ بن قینؒ نے حضرت عباسؑ سے عرض کی:

اے میرے سردار! اگر اجازت ہو تو اس وقت ایک حدیث بیان کروں!

فرمایا- اجازت ہے بیان کرو۔ زہیرؓ نے حضرت عقیلؓ سے متعلق اسی روایت کا ذکر کیا اور حضرت اُم البنینؑ کے ساتھ امیرالمؤمنینؑ کے عقد کی تفصیل بیان کی اور پھر عرض کی شاہزادے! وہ معرکۂ کربلا اور وہ میدانِ شہادت جس کا

آپ کے والد نے تذکرہ کیا تھا آج ہی ہے جس کے لئے آپ کی پیدائش ہوئی ہے۔ آج حضور! اپنے بھائی امام حسینؑ کی نصرت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیئے گا۔ یہ سن کر شیر خدا کے شیرؑ نے جوش میں آکر ایسی انگڑائی لی کہ گھوڑے کی دونوں رکابیں ٹوٹ گئیں!

فرمایا: اَتُشَجِّعُنِیْ یَا زُہَیْرُ! اے زُہیر کیا تم مجھے شجاعت دلا رہے ہو! خدا کی قسم نصرتِ فرزندِ رسولؐ میں ایسی جنگ کروں گا جو یادگار رہ جائے گی!

عاشور کے دن ایک وقت وہ بھی آگیا جب امام حسینؑ نے اپنے بھائی کو اس کی اجازت دی کہ وہ اپنی پیاسی کمسن بھتیجی سکینہؑ بنت حسینؑ اور دوسرے پیاسے بچوں کے لئے نہر فرات سے پانی لے آئیں۔ یہ منظر بڑا ہی دلخراش تھا جب تمام پیاسے اور بھوکے بچے حضرت علمدارؑ کے گرد جمع تھے اور "اَلْعَطَشْ اَلْعَطَشْ" ہائے پیاس ہائے پیاس! کی فریاد کر رہے تھے۔ اس وقت خدا ہی جانتا ہے کہ عباسؑ بن علیؑ جیسے غیور اور عظیم بہادر کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی جو لشکر حسینی کا علمدار ہونے کی حیثیت سے بھی بڑی ذمہ داری

کا مالک تھا - اجازتِ امامؑ ملنے کے بعد حضرت ابوالفضلؑ نے
ایک سوکھی ہوئی مشک اٹھا کر کاندھے پر رکھی اور میدان کی
طرف رخ کیا اور نہر فرات کو نگاہوں میں لیکر گھوڑے کو
ایڑ دی - امام حسینؑ جانتے تھے کہ عبّاسؑ اب زندہ واپس نہ
آئیں گے اس لیئے چلتے وقت آپ نے انھیں دل کھول کر
گلے لگایا اور اُس طرح رخصت کیا جیسے شہید ہونے والے
جانبازوں کو رخصت کیا جاتا ہے اور اس غرض سے کہ کہیں
عبّاس کو اس طرح رخصت ہوتے ہوئے حضرت زینبؑ
و امّ کلثومؑ آپ کی بہنیں نہ دیکھ لیں آپ نے اُن کو خیامِ
حسینیؑ سے آگے بڑھ کر کچھ فاصلہ پر رخصت کیا تھا کیونکہ آپ
اس بات کو خوب جانتے تھے کہ تمام مخدّراتِ عصمت اور سب
بچے عبّاسؑ علمدار کی زندگی سے بڑے مطمئن ہیں اور سب
کا دل ٹھہرا ہوا ہے اور وہ سب ہی کے لیئے بڑا سہارا ہیں
علمدارِ لشکرِ حسینیؑ گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے اور لشکرِ یزیدِ لعیں
کی آہنی صفوں کو چیرتے ہوئے نہرِ فرات تک پہنچ گئے اور
گھوڑے کو نہر میں اُتار دیا - مشکِ سکینہؑ پانی سے بھر لی.
خود چلّو میں پانی لیا، غور سے پانی کی طرف دیکھا اور پھر تین دن

کی پیاس کے باوجود پانی کو نہیں پھینک دیا اور فرمانے لگے:
وَاللّٰہِ لَا اَذُوْقُ الْمَاءَ وَلَا اَشْرَبُہٗ وَاَخِی الْحُسَیْنُ وَعِیَالُہٗ وَاَطْفَالُہٗ عِطَاشٌ لَاکَانَ ذٰلِکَ اَبَدًا" خدا کی قسم میں ہرگز پانی نہیں پیوں گا۔ ! اسے چکھوں گا بھی نہیں۔ ! جبکہ میرے بھائی امام حسینؑ اور آپ کے گھر والے اور آپ کی اولاد پیاسی ہے۔ ہرگز نہیں ! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ !

عباسؑ بن علیؑ مشک بھر کر خیام حسینی کی طرف بڑھے مگر سفاک فوجیوں نے بھرپور طاقت سے راستہ روکا اور چاروں طرف سے تیروں اور تلواروں کی بارش ہونے لگی۔ قمر بنی ہاشم کی کوشش تھی کہ کسی طرح بھی یہ پانی بچوں تک پہنچ جائے۔ اسی ہنگامے میں ایک شخص نے چھپ کر آپ کے داہنے ہاتھ پر تلوار کا وار کیا جس سے وہ کٹ گیا۔ علیؑ کے شیر نے بائیں ہاتھ میں تلوار لیکر مدافعت کی مگر کچھ دور پہنچ کر بایاں ہاتھ بھی کاٹ ڈالا گیا اور ساتھ ہی ایک تیر مشک پر لگا جس سے سارا پانی بہہ گیا ادھر ایک وحشی ظالم نے پشت کی طرف سے سر اقدس پر آہنی گرز سے حملہ کر دیا اور اسلام کے اس عظیم اور وفادار سپاہی کا سر پاش پاش ہو گیا۔ عباس علمدار نے گھوڑے سے گرتے ہوئے مشکِ سکینہؑ کو

کلیجہ سے لگا لیا اور خیموں کی طرف رخ کر کے فرزندِ رسولؐ کو پکارا کہ اب آقا میری مدد کو آئیے!

میں نے آپ کے قدموں پر جان نثار کر دی ۔ ! حضرت سیّدؑ الشہداء نے جب اپنے عَلَمِ لشکر کو جھکتے ہوئے دیکھا اور بھائی کی آواز سُنی تو کمر پکڑ کر یہ فرمانے لگے: اَلْاٰنَ اِنْکَسَرَ ظَهْرِیْ وَقَلَّتْ حِیْلَتِیْ

عبّاسؑ! تمہارے مرنے سے اب میری کمر ٹوٹ گئی اور راہِ چارہ و تدبیر بند ہو گئی ۔ عبّاسؑ وفا اور بہادری کا مجسّمہ تھے عباسؑ ایمان اور علم و معرفت کی تصویرِ کامل تھے! عباسؑ حق و دیانت کی صدا تھے ۔!

شجاعت و بسالت، ایمان و غیرت، خود داری اور وفا کے مجموعہ ہی کا نام عبّاسِؑ علمدار ہے! اُس عظیم روح و جانِ وفا پر ہمارا سلام!

حضرت علیؑ

اسلام کی تاریخ کا ایک عظیم باب وہ بھی ہے جس کا تعلق شیرِ خدا حضرت علیؓ مرتضیٰ علیہ السلام سے ہے۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کی عمرِ مبارک دس برس کی تھی۔ بعثت کے بعد ۱۳ سال تک آپ آنحضرتؐ کے ساتھ مکہ ہی میں مقیم رہے اور حضورِ انور سے تربیت پانے کا شرف حاصل کرتے رہے اور جس وقت حضرت رسولؐ اللہ نے ہجرت فرمائی تو آپ کی عمر ۲۳ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ حضرتِ علیؑ کی تربیت ابتدا ہی سے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نے فرمائی تھی جس کا تمام مورخوں نے اظہار کیا ہے۔

آپ کا سنِ مبارک، جب دس برس کا ہوا تو وہ وقت آیا جب پیغمبرؐ اکرم کو بارگاہِ خداوندی سے اعلانِ نبوت کا حکم ملا۔ اس یادگار موقع پر جس شخصیت نے مردوں کی صف میں سب سے پہلے لبیک کی آواز بلند کی وہ حضرتِ علیؑ کی ذاتِ اقدس ہی تھی۔ عفیف

کندی بیان کرتے ہیں کہ میرا اپنے تجارتی کاموں کے سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کے پاس جانا ہوا۔ وہ اُس وقت مقام منیٰ میں تھے۔ دوپہر ہو رہی تھی، سورج ڈھلنے والا تھا عین اُس وقت میں نے دیکھا کہ قریب کے ایک خیمہ سے کوئی شخص باہر آیا، اُس نے سورج کی طرف دیکھا کہ وہ ڈھل چکا ہے تو وہ فوراً عبادتِ الٰہی کے لیئے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُسی وقت یہ بھی دیکھا کہ اُسی خیمہ سے ایک خاتون برآمد ہوئیں اور بڑھکر وہ اُس بزرگ کے پیچھے کھڑی ہو گئیں پھر ایک بچہ آیا اور وہ بھی ان دونوں کے ساتھ عبادت کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضرت عباسؓ بن عبد المطلب سے میں نے دریافت کیا کہ یہ سب کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ پہلا شخص میرے بھتیجے محمدؐ بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہیں اُن کے پیچھے اُن کی زوجہ خدیجہ بنت خویلد ہیں اور یہ میرا دوسرا بھتیجا علیؑ بن ابی طالب ہے۔ میرے بھتیجے محمدؐ بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے دینِ اسلام کا اعلان کیا ہے اور اسی دین کے مطابق یہ سب لوگ عبادت میں مشغول ہیں۔ عفیف کندی کچھ عرصہ کے بعد مسلمان ہو گئے

تھے اور بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے: کاش میں بھی اُس وقت مسلمان ہوتا اور میں بھی حضرت علیؑ مرتضٰی کے ساتھ سرورِ انبیاءؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضورؐ انور دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مشرکینِ مکہ آپ کے خون کے پیاسے تھے۔ آپ دشمنوں کے خیال سے اپنے بچاؤ کی کوشش میں پہاڑوں کی تنہائیوں میں، غاروں میں اور سنسان میدانوں میں اللہ کی عبادت کرتے رہتے تھے اور اس تنہائی کے عالم میں آپ کا شریک اور بے حد وفادار ساتھی حضرتِ علیؑ مرتضٰی کے سوا اُس وقت کوئی نہ تھا۔ شیرِ خداؑ نے اپنے ایک مشہور خُطبہ میں خود بھی اس منظر کو اس طرح بیان فرمایا ہے "میں نے تو بچپنے ہی میں عرب کے بہادروں کو زمین کا پیوند بنا دیا تھا اور مشہور قبیلہ ربیعہ و مُضر کے اُبھرے ہوئے سینگوں کو توڑ دیا تھا یعنی ان کے غرور و تکبّر کو مٹا دیا تھا۔ تم لوگ تو جانتے ہی ہو کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے قریبی رشتہ داری اور مخصوص قدر و منزلت کی وجہ سے میرا مقام اُن کی بارگاہ میں کس قدر اُن سے نزدیک تھا۔ میں اُس وقت بچہ تھا جب حضورؐ انور نے مجھے گود میں لیا تھا، وہ مجھے سینہ سے

چمٹائے رکھتے تھے، بستر پر اپنے پہلو میں جگہ عنایت فرماتے تھے اور میں حضورؐ کے بدنِ مبارک کی خوشبو سونگھتا تھا۔ پہلے آپ کسی چیز کو چباتے تھے پھر اس کے لقمے بنا کر میرے منہ میں دیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے نہ تو میری کسی بات میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا اور نہ میرے کسی کام میں لغزش اور کمزوری ملاحظہ فرمائی۔ اللہ نے حضورؐ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے فرشتوں میں سے ایک بلند منزلت فرشتہ کو آپ کے ساتھ کر دیا تھا جو حضورؐ کی خدمت میں محاسنِ آداب اور مکارمِ اخلاق سے پیش آتا تھا اور میں اُن کے پیچھے پیچھے اس طرح لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے رہتا ہے۔ حضورؐ ہر دن میرے لیئے اخلاقِ حسنہ کے پرچم بلند کرتے تھے اور مجھے اُن کی پیروی کا حکم دیتے تھے حضورؐ ہر سال کوہِ حرا میں کچھ روز قیام فرماتے تھے اور وہاں میرے علاوہ اور کوئی انھیں نہیں دیکھتا تھا، میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوّت کی خوشبو سونگھتا تھا۔

جب آپ پر پہلے پہل وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی۔ جس پر میں نے عرض کی یا رسولؐ اللہ یہ آواز کیسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے جو اب میری بعثت

کی وجہ سے اپنے پوجے جانے سے مایوس ہوگیا ہے (خطبہ قاصعہ از نہج البلاغہ) کفار و مشرکین کی شدید مخالفتوں کا حال اسلامی مورّخوں نے پوری طرح واضح کر دیا ہے لیکن اس مخالفت کے طوفان کے باوجود اسلام کی ترقی کو کسی طرح بھی روکا نہ جا سکا اور ہر روز مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اسلام کی ترقی اور جاہ و جلال دیکھ کر دشمنوں کے دلوں میں حسد کی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور تمام کفارِ مکّہ نے ملکر یہ طے کر لیا کہ اب بنی ہاشم سے ہر قسم کے تعلقات کو ختم کر دیا جائے۔ اور اُن سب کو معاشرہ سے خارج کر دیا جائے اور جیسے جہاں بھی موقع ہاتھ آجائے وہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو ہلاک کر ڈالے۔ جب یہ خبر رسول اللہ کے چچا حضرتِ اَبُوطالبؑ کو ہوئی تو انہوں نے پہاڑ میں اپنے خاص دَرّہ یعنی گھاٹی میں جس کا نام "شعب ابی طالب" تھا خود حضورؐ کو اور تمام بنی ہاشم کو محفوظ کر دیا۔ کئی سال تک یہ صورتِ حال جاری رہی۔ شہر کی آبادی میں بنی ہاشم کی آمد و رفت بالکل بند تھی، ضروریات کی تمام چیزوں پر مشرکین مکّہ کی طرف سے کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی کہ وہ اِن گھرے ہوئے اور محصور لوگوں

تک نہ پہنچائی جا سکیں اور ساتھ ہی دشمن دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ سرورؐ دو عالم کی حیاتِ طیبہ کو ختم کر دیں۔ ایسے ہولناک ماحول میں حضرت ابوطالبؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو رات کے وقت دیر تک ایک ہی جگہ پر نہیں سلاتے تھے بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے رسولؐ اکرم کو پہلی جگہ سے ہٹا کر کسی دوسرے مقام پر لٹا دیتے تھے اور پہلی جگہ پر اپنے فرزند حضرت علیؑ مرتضیٰ کو سُلا دیا کرتے تھے تاکہ اگر رسولؐ اللہ کے دشمن وہاں آجائیں تو رسولؐ محفوظ رہیں اور علیؑ قربان ہو جائیں۔ اس طرح حضرت علیؑ مرتضیٰ نے مسلسل کئی سال تک "شعبِ ابی طالب" میں رسولُ اللہ کی حفاظت کا فرض انجام دیا اور عملی قربانی اور وفاداری کی ایسی مثال پیش کر دی جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔ بعثت کے دسویں سال حضرت علیؑ کی ذمہ داریوں اور وفاداری کا ایک جدید اور انتہائی اہم دور شروع ہوا۔ دشمنوں کی طرف سے خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد ہی کیا تھی کہ وہ کھل کر کفار و مشرکین کی متحدہ قوت کا مقابلہ کر سکتے اور اُن سے ٹکر لیتے آخر مسلمانوں کو مکہ چھوڑنا پڑا اور خود حضورؐ نے بھی مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اپنے وطن کو چھوڑ دیا۔ وہ کس قدر

خوفناک اور بھیانک رات تھی جب رسولِ اسلام اپنا محبوب وطن چھوڑ کر ہجرت فرما رہے تھے۔ خانۂ رسالت کے گرد دشمنوں کی تلواریں آپ کا پاک لہو بہانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اس خطرناک رات میں بستر پیغمبرِ خدا پر سونے کا شرف بھی حضرت علیؑ مرتضٰی ہی کو عطا کیا گیا اور آپ نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر حضورِ انور کی حفاظت کا فرض پورا کیا۔ ہجرت کے بعد حضرت علیؑ کی اسلامی خدمتوں کا تیسرا دور شروع ہوا اور ۲ھ میں حکمِ جہاد آجانے کے بعد آپ کے سینہ میں جذبۂ دین اور ولولۂ قربانی کے طوفانی دھاروں کے تمام بند ٹوٹ گئے اور وہ تلوار جو میدانِ کارزار میں خدمتِ اسلام کے لیے نیام کے اندر بے چین تھی اب آزاد ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی حربی اور مسلمانوں کی سرفروشانہ تاریخ کا آغاز ہو گیا۔ اور پوری تاریخ میں حضرتِ علی مرتضٰی علیہ السلام کی زرّیں خدمات ایک ایسے مقام پر ہیں جو اپنی آپ ہی مثال ہے۔ آپ کی عظمت پر اگر صرف اسی پہلو سے غور کیا جائے تو بالکل کافی ہو گا کہ جس عظیم بچہ کو ابتدا ہی سے ایسے عظیم ترین استاد کی تربیت ملی ہو اور خود اس بچہ میں اس معلّمِ کامل سے استفادہ کرنے کی اس حد تک پوری استعداد

اور صلاحیت موجود ہو جس کا کسی طرح بھی امکان ہو سکتا ہے تو اس کا یقینی نتیجہ سوائے اس کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بچّہ اپنے استاد اور معلّم کے تمام کمالات، صفات اور کردار کا آئینہ دار ہوگا۔ بس یہی حالت حضرت علیؑ مرتضیٰ کی بھی تھی کہ وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے خُلقِ عظیم، علم و معرفت، شجاعت و حکمت، تدبّر و استقلال، سخاوت و عبادت۔ عزم و ہمّت، عدل و انصاف اور زہد و تقویٰ نیز دیگر صفات و کمالات میں حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کا بہترین نمونہ اور کامل ترین مثال تھے۔

شیرِ خداؑ

امیر المؤمنین علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام اسلام کی اُن عظیم ترین اور مایہ ناز ہستیوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی انسانی فلاح وبہبود کے پاک مقصد کیلئے وقف رکھی، اُن کی حیات اسلامی کردار کی سچی تصویر تھی اور وہ ہمیشہ وہی چاہتے اور کرتے تھے جو اسلام کا مقصد تھا آپ نے حضرت پیغمبرؐ اسلام سے تعلیم وتربیت کا شرف عظیم حاصل کیا تھا اور اپنی پوری عمر میں کبھی ایک لمحہ کے لیئے آپ نے اُن ذمہ داریوں اور تقاضوں سے اپنا قدم ہٹنے نہ دیا جو انفرادی، خاندانی اور عوامی زندگی کی طرف سے آپکی ذات پر عائد ہوتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبوں، خطوط اور مقالات سے اسلام کی اُس روح کو اجاگر کر دیا جو پیغمبرؐ اکرم کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور اس طرح انسانی شعور میں ایک عظیم ترین تعمیری انقلاب کا باعث بنے، آپنے فکر انسانی کے دھارے کو حقیقت پسندی کی طرف موڑ دیا اور اُس کے لیئے نئی نئی راہیں پیدا کر دیں۔

حضرت علیؑ بن ابی طالب کی مقدس حیات کی قدریں ذہنِ جدید و قدیم کے اہم ترین تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ وہ ایثارِ نفس شجاعت، علم و معرفت، عبادت و تقویٰ، سخاوت و عدالت، صبر و استقلال، خُلق و مروّت اور حُسنِ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اُن کی ہمّت و جرأت اور خود داری اور خود اعتمادی کی زرّیں مثالوں نے انسان کے طرزِ فکر کے لیئے نیا ماحول پیدا کر دیا آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ انسانی ضمیر میں اللہ کا ڈر اس طرح پیدا ہو جائے کہ اُس کو کسی مادّی نگرانی کی ضرورت باقی نہ رہے اور احساسِ فرض میں خود اتنی قوت آجائے کہ وہ ہوس پرستیوں اور خود غرضانہ خواہشات پر پہرے لگا سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان بغیر کسی دنیاوی بیرونی دباؤ اور ظاہری نگرانی کے خود ہی قانون کے احترام کا عادی بن جائے اور اُس میں فرض شناسی کا وہ جذبہ پیدا ہو سکے جو کسی طاقت سے بھی نہ دبایا جا سکے۔ اسلام جس انسانی اخوّت کی تعلیم دینے آیا تھا حضرت علیؑ نے اپنی زندگی سے عملی طور پر اُس کو پوری طرح واضح کر دیا اور یہ بتا دیا کہ حقیقی عزّت و سربلندی صرف اُسی کا حق ہو سکتا ہے جو عمل کے لحاظ سے برتری رکھتا ہو خواہ وہ کسی نسل سے ہو یا کسی خطّہ زمین کا رہنے والا ہو۔ آپ غریبوں

کے ساتھ بیٹھنے میں ہمیشہ مسرت محسوس کرتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ "ایک فقیر ہے جو فقیروں میں بیٹھا ہے"۔

آپ کے دربار میں ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ ہوتے تھے جو اپنے رہنما کے ارشادات اور عملی زندگی سے سبق حاصل کرتے تھے اور آپ اُن سب کے ساتھ انصاف وعدالت کا برتاؤ کرتے تھے آپ کا اعلان تھا کہ اگر مجھے ساری دنیا کی دولت وحکومت دیدی جائے اور مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں وہ دانہ چھین لوں، جو ایک چیونٹی اپنے مُنہ میں لے جارہی ہو تو میں کبھی ہرگز ایسا نہ کروں گا امیر وغریب، اپنے اور پرائے، چھوٹے اور بڑے سب ہی آپ کے انصاف سے مطمئن رہتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ آپ عدل کے تقاضوں کو کبھی فراموش نہیں فرماسکتے بیشک آپ کا ہر فیصلہ اسلامی عدل کا مکمّل نمونہ تھا۔

شہادتِ حضرت علیؑ کے بعد ایک مرتبہ امیر شام نے ضِرار رضؓ بن ضمرہ سے پوچھا تھا کہ وہ اُن کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ضِرار نے کہا تھا، کَانَ وَاللّٰہِ صَوَّامًا بِالنَّھَارِ قَوَّامًا بِاللَّیْلِ یُحِبُّ مِنَ اللِّبَاسِ اَخْشَنَہٗ وَمِنَ الطَّعَامِ اَجْشَبَہٗ وَکَانَ یَجْلِسُ فِیْنَا وَیَبْتَدِیُٔ اِذَا سَکَتْنَا وَیُجِیْبُ اِذَا سَأَلْنَا یَقْسِمُ بِالسَّوِیَّۃِ

وَلِعَدْلِہٖ بِالرَّعِیَّۃِ لَا یَخَافُ الضَّعِیْفُ مِنْ جَوْرِہٖ وَلَا یَطْمَعُ الْقَوِیُّ فِیْ مَیْلِہٖ الخ

وہ دن کو روزہ رکھتے تھے اور شب بھر عبادت الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے، کبھی اُنھوں نے قیمتی لباس اور لذیذ غذا میں استعمال نہ کیں، وہ بلا تکلف ہم لوگوں میں بیٹھا کرتے تھے اگر ہم اُن کے رعب وجلال کی وجہ سے بات نہ کر سکتے تھے تو وہ خود ہی گفتگو کا آغاز فرماتے تھے اور جو کچھ ہم پوچھتے تھے اُس کا جواب مرحمت فرماتے تھے، وہ ہمیشہ تقسیم اموال میں مُساوات حقوق کا لحاظ رکھتے تھے اور رعیّت کے ساتھ انصاف وعدالت سے کام لیتے تھے، کمزوروں کو کبھی اس کا خوف نہ ہوتا تھا کہ وہ اُن پر ظلم کریں گے اور طاقت رکھنے والوں کو اس کی کوئی امید نہ تھی کہ آپ اُن کی وجہ سے حق کے راستہ کو چھوڑ سکتے ہیں

ضرارؓ کہتے ہیں کہ میں نے علیؑ بن ابیطالب کو رات کی تاریکیوں میں خوفِ خدا سے روتے ہوئے پایا ہے اور اسطرح دنیا کو خطاب کرتے ہوئے سُنا ہے کہ "تو مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتی ہائے سفر کتنا طولانی ہے، راستہ کتنا وحشتناک ہے اور زادِ سفر کس قدر کم ہے"۔

اپنے دورِ خلافت ظاہری میں حضرت امیر المومنین کو بصرہ کے گورنر کے متعلق شکایت وصول ہوئی کہ انہوں نے روسائے شہر کی دعوت میں شرکت کی تھی۔ یہ سن کر آپ نے اُن کو تحریر فرمایا تھا:

وَمَا ظَنَنْتُ اَنَّکَ تُجِیْبُ اِلٰی طَعَامِ قَوْمٍ عَائِلُھُمْ مَجْفُوٌّ وَغَنِیُّھُمْ مَدْعُوٌّ۔

مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ تم ایک ایسی جماعت کی دعوت قبول کرو گے جو غریبوں کو نظر انداز کرتی ہے اور صاحبانِ دولت کو دعوت دیتی ہے۔

اَلَا وَاِنَّ اِمَامَکُمْ قَدِ اکْتَفٰی مِنْ دُنْیَاہُ بِطِمْرَیْہِ وَمِنْ طُعْمِہٖ بِقُرْصَیْہِ۔"

آگاہ رہو! تمہارے امام نے اپنی دنیا سے اپنے پہننے کے لئے صرف دو پرانے کپڑے حاصل کئے ہیں اور غذا کے لئے صرف دو سوکھی روٹیاں۔ اَلَا وَاِنَّکُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ عَلٰی ذٰلِکَ وَلٰکِنْ اَعِیْنُوْنِیْ بِوَرَعٍ وَّاجْتِہَادٍ وَّعِفَّۃٍ وَّسَدَادٍ۔"

آگاہ ہو جاؤ کہ تم یقیناً اس حد تک قدرت نہیں رکھتے مگر کوشش کرو اور جس قدر بھی دنیا داری سے بچنا ممکن ہو اس

میں سعی کرنے سے غافل نہ رہو اور اپنے اس عمل اور کوشش سے میری مدد کرو۔

فَوَاللّٰهِ مَا كَنَزْتُ مِنْ دُنْيَاكُمْ تِبْرًا وَلَا ادَّخَرْتُ مِنْ غَنَائِمِهَا وَفْرًا۔"

اللہ کی قسم میں نے تمہاری دنیا میں سے سونے کے ٹکڑے جمع نہیں کیے اور نہ اس کے ذخیروں میں سے دولتیں اکٹھا کی ہیں۔

وَلَوْ شِئْتُ لَاهْتَدَيْتُ الطَّرِيقَ إِلَى مُصَفَّى هٰذَا الْعَسَلِ وَلُبَابِ هٰذَا الْقَمْحِ وَنَسَائِجِ هٰذَا الْقَزِّ۔"

اگر میں چاہتا تو دنیا کے اس شہد تک رسائی حاصل کرسکتا تھا میرے لیے اس گیہوں کے مغز تک پہنچ جانا ممکن تھا اور میں ریشمی لباس زیب جسم کرسکتا تھا۔

وَلٰكِنْ هَيْهَاتَ أَنْ يَغْلِبَنِي هَوَايَ وَيَقُودَنِي جَشَعِي إِلَى تَخَيُّرِ الْأَطْعِمَةِ۔"

لیکن یہ بات بہت دور ہے کہ مجھ پر خواہش نفس غالب آسکے اور حرص و ہوس مجھے اس پر مائل کرسکے کہ میں لطیف غذاؤں کے منتخب کرنے میں مشغول ہو جاؤں اور شاید

ملک میں ایسے مفلس اور محتاج لوگ بھی ہوں جن کو روٹی تک میسّر نہ ہو۔ "اَوْ اَبِيْتُ مِبْطَانًا وَحَوْلِیْ بُطُوْنٌ غَرْثٰی وَاَكْبَادٌ حَرّٰی"۔

یا میں شکم سیر ہو کر رات بسر کروں اور میرے گردوپیش کچھ بھوکے شکم اور پیاس سے جلتے ہوئے جگر ہوں۔

"اَاَقْنَعُ مِنْ نَفْسِیْ بِاَنْ یُّقَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلَا اُشَارِكُهُمْ فِیْ مَكَارِهِ الدَّهْرِ اَوْ اَكُوْنَ اُسْوَةً لَّهُمْ فِیْ جُشُوْبَةِ الْعَیْشِ"۔

کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں اپنے نفس کے لیئے اس بات پر قناعت کروں کہ مجھے "امیرالمؤمنین" کے ساتھ خطاب کیا جائے اور میں زمانہ کے مصائب میں اپنی رعیّت کا شریک نہ بنوں یا اپنی زندگی کو مثال بنا کر پیش نہ کروں پھر فرمایا کہ میں اُس حیوان کی طرح ہرگز مخلوق نہیں ہوا ہوں۔ جس کی کوشش صرف یہ رہتی ہے کہ اپنا چارہ تلاش کر لے بلکہ میری خلقت کا مقصد اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔

حضرت علیؑ کی مبارک زندگی ایسے کمالات وصفات کا مجموعہ تھی جو کسی واحد شخصیّت میں بہت ہی مشکل سے نظر آسکتے ہیں۔ اُن کے زہد و عبادت کی کوئی حد نہ تھی وہ میدان

جنگ کے عظیم ترین شہسوار تھے، وہ ایک بے نظیر حکیم و فلسفی تھے، وہ لاجواب خطیب تھے جن کے زورِ کلام کے سامنے جزیرہ نمائے عرب کے ادیبوں نے اپنے سر جھکا دیئے تھے۔ وہ پیغمبرِ اکرمؐ کے بھائی، داماد اور جانشین تھے۔ لیکن ساتھ ہی فقیروں اور غریبوں کے مجمع میں ایک فقیر اور مزدوروں کی صف میں ایک جفاکش مزدور کی طرح اپنی روزی اپنی محنت سے کمانے کے عادی تھے۔

انہوں نے حکمرانی بھی قبول فرمائی مگر صرف اس لیئے کہ وہ بتا سکیں کہ ایک حکمران کی ذمہ داریاں کیا ہو سکتی ہیں اور یہ دنیاوی اقتدار بھی ایک امانت الٰہی ہے جس کا غلط استعمال کسی کے لیئے بھی جائز نہیں ہو سکتا اور یہ حق صرف اس لیئے دیا جاتا ہے کہ انسان خلقِ خدا کی خدمت اس کے مقرر کردہ راستوں پر کرتا رہے۔

وہ ہمیشہ انسانی نسل کو صحیح کردار حاصل کرنے کی تعلیم دیتے رہے اور بتاتے رہے کہ انسان کی برتری صرف اس میں ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرے اور اُسکے احکام و ہدایات پر عمل کرے ایک مشہور خطبہ میں اُن کا ارشاد ہے:

اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ وَکَمَالُ مَعْرِفَتِہٖ اَلتَّصْدِیْقُ بِہٖ " دین کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے اور اُس کی معرفت کا کمال یہ ہے کہ اُس کے وجود کی تصدیق کی جائے۔ اس لئے حقیقی مسلمان کی مثال یہ ہے کہ اس کا ہر قول و عمل اس کی شہادت دے سکے کہ وہ ایک حیّ و قیوم اور قادرِ مطلق اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جو ایسا ہوگا وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، چوری نہیں کر سکتا، خیانت نہیں کر سکتا ظلم نہیں کر سکتا، بدکاری میں مبتلا نہیں ہو سکتا، اپنے فائدہ کے لیئے دوسروں کی ذلت و تکلیف برداشت نہیں کر سکتا، رشوت ستانی اور اقربا نوازی جائز نہیں قرار دے سکتا، جماعتی اور مذہبی فرائض میں کوتاہی نہیں کر سکتا، یہ عمل کی کمزوریاں تو محض اس وجہ سے ہوا کرتی ہیں کہ ان کی بنیاد جس اعتقاد پر ہے اسی میں کمزوری پائی جاتی ہے۔ اگر اُس میں قوت ہو، اگر اُس میں کمال ہو تو اس کا اثر انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑنا ضروری ہوگا۔

امیر المومنین علیؑ کی زندگی کا سب سے بڑا مشن اسلامی کردار کی تعمیر تھا۔ انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی کہ اُن کے

ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی اُن کی کوشش صرف یہ تھی کہ مسلمان نام کے نہ ہوں بلکہ کام کے ہوں اور وہ صحیح طور پر اسلام کے فلسفہ کو سمجھیں اور اپنے کردار کی اللہ کی ہدایات کے مطابق تعمیر کریں۔ اُن کے نزدیک وہ چند پکے اور سچے مسلمان جو خدا اور اُس کے دین کی صحیح معرفت رکھتے ہوں اُن لاکھوں افراد سے افضل ہوں گے جن کی زندگی اسلامی شعائر و اخلاق کے منافی ہو۔

امیرُالمؤمنین حضرت علیؑ نے اپنے دورِ خلافت میں مِصر کے نامزد گورنر مالکؒ اشترؒ کو جو ہدایات جاری کی تھیں اُن کے مطالعہ سے بھی آپ کے نظریات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور آپ کی مقدس سیرت کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

آپ نے گورنر کو ہدایت کی تھی کہ وہ خدا سے ڈرتے رہیں اور اُس کی اطاعت کو ہر چیز پر مقدم رکھیں اور اُن واجب و سنت احکام پر عمل کریں جو خدا نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبرؐ کے ذریعہ سے بتا دیئے ہیں اور اپنے دل، ہاتھ اور زبان سے خدا کی نصرت کریں۔

اے مالکِ اشترؒ! یہ سمجھ لو کہ میں تم کو اُن شہروں

کی طرف بھیج رہا ہوں جہاں تم سے پہلے صاحبِ عدل اور صاحبِ جور سلطنتیں گذر چکی ہیں یاد رکھو کہ لوگ تمہارے اعمال کو بھی اُسی طرح دیکھیں گے جس طرح تم دوسروں کے اعمال کو دیکھتے ہو اور صالحین کی نیکی پر ذکرِ جمیل سے استدلال کیا جاتا ہے۔

جو اللہ زبانِ خلق پر جاری کر دیتا ہے۔ اپنی خواہشاتِ نفسانی پر قابو رکھو، اور اُن چیزوں سے اپنے نفس کو باز رکھو جو تمہارے لیے حلال نہ ہوں۔ اس دُنیا میں ہر ایک پر دوسرا نگران ہے۔ تم اُن لوگوں پر حاکم ہو، تمہارا امیر تم پر نگران ہے، اور خدا سب پر نگران ہے۔ خدا سے جنگ کرنے اپنے نفس کو تعب میں نہ ڈالو کیونکہ تم میں نہ تو اُس کے عذاب کو دفع کرنے کی قوت ہے اور نہ اُس کے عفو و رحمت سے مستغنی ہونے کی طاقت ہے، غصہ میں کوئی ایسا کام کرنے کی جلدی نہ کرو جس کے ترک کی گنجائش ہو اور جب تمہارے دل میں تکبر و غرور کے آثار پیدا ہونے لگیں تو تم غور کرو کہ خدا کی حکومت تم پر کس قدر عظیم الشان ہے اس سے تمہاری گئی ہوئی عقل واپس آجائے گی۔ حضرت علیؑ، پیغمبرِ اسلام

سے تیس ۳۰ برس عمر میں کم تھے۔ آپ کی ولادت سنہ ۳۰ (عام الفیل) سنہ ۶۰۰ء میں ہوئی اور شہادت ۲۱ رمضان سنہ ۴۰ھ مطابق سنہ ۶۶۱ء میں واقع ہوئی تھی۔

اپنے ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور جو کچھ کرنا اُس میں اُس کی رضا و خوشنودی کو مقدّم رکھنا، غریبوں، مسکینوں اور مصیبت زدوں سے ہمیشہ محبت و ہمدردی کا برتاؤ کرنا اور کبھی انسانوں کی بھلائی اور اصلاح کے کاموں میں کوتاہی نہ کرنا"۔ یہ تھے وہ آخری الفاظ جو امام عالی مقام نے اپنے بڑے فرزند امام حسنؑ سے بطور وصیّت فرمائے تھے۔

شاہِ لافتیٰ

حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام پیغمبر اسلام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے - آپکی ولادت ۳۰ سنہ (عام الفیل) مطابق ۶۰۰ء سنہ خانہ کعبہ میں ہوئی تھی -

جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب میں بحوالہ امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں :

قَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَخْبَارُ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ اَسَدٍ وَلَدَتْ عَلِیًّا فِیْ جَوْفِ الْکَعْبَۃِ

یعنی اخبار و احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے یہاں حضرت علیؑ کی ولادت عین کعبہ میں ہوئی تھی - حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی یہ رباعی مشہور ہے -

وقتیکہ بہ کعبہ مرتضیٰ شد پیدا ؛ در ارض و سما جلوہ نما شد پیدا
جبریل ز آسمان فرود آمد و گفت ؛ فرزند بخانہ خدا شد پیدا

آپکے والد ماجد حضرت ابو طالبؑ عم سرکار رسالت تھے - علامہ

ابنِ حجر عسقلانی فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

جناب رسولِ خدا نے حضرت علیؑ کی تربیت اُنکے بچپنے ہی سے فرمائی تھی - فَلَازَمَہٗ مِنْ صِغَرِہٖ فَلَمْ یُفَارِقْہُ اِلیٰ اَنْ مَاتَ - یعنی علیؑ مرتضیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ اپنے بچپن ہی سے رہے اور آنحضرتؐ کی رحلت تک اُن سے جدا نہ ہوئے - ظاہر ہے کہ جس بچہ کو ایسے معلّمِ کامل کی تربیت کا شرف حاصل ہوا ہو اور خود اُس میں اس تربیت سے استفادہ کی پوری صلاحیت موجود ہو اُس کا کردار کسقدر بلند ہوگا اور بلاشبہ وہ اخلاق و صفاتِ رسولؐ کا بہترین نمونہ ہوگا -

آپ نے اپنی زندگی میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی بت پرستی نہیں کی - بعثتِ رسولؐ کے بعد مردوں کی صنف میں پہلے آپ نے جناب رسالتمآبؐ کیساتھ نماز پڑھنے کا شرف حاصل کیا - شبِ ہجرت حکمِ رسولؐ کے مطابق آپ ہی آنحضرتؐ کے بستر پر سوئے اُس وقت کہ جب چاروں طرف خون کے پیاسے دشمنوں کا نرغہ تھا - آپ حضرت فاطمہؑ بنتِ رسولؐ کے شوہر تھے اور حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے والد - ہجرت کے بعد جب رسولؐ اللہ نے ایک مسلمان کو دوسرے کا بھائی قرار دیا تھا تو حضرت علیؑ کے لیئے ارشاد فرمایا تھا کہ: اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا

والآخرۃ" اے علیؑ دنیا و آخرت میں تم میرے بھائی ہو۔

علامہ ابن ہشام نے سیرۃ النبیؐ میں اس واقعہ کو یوں لکھا ہے کہ جناب سرور کائنات نے جماعتِ صحابہؓ میں مہاجرین و انصار کے درمیان اخوت کے رشتے قائم کیئے اور ارشاد فرمایا کہ مجھے خدا کا حکم ملا ہے کہ میں تم لوگوں کے درمیان صیغۂ اخوت جاری کروں تاکہ تم لوگ بھائی بھائی ہو جاؤ۔

"ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ ھٰذَا اَخِیْ" اس کے بعد آپ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ یہ میرا بھائی ہے۔

"فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ سَیِّدُ الْمُرْسَلِیْنَ وَاِمَامُ الْمُتَّقِیْنَ وَرَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الَّذِیْ لَیْسَ لَہٗ خَطِیْرٌ وَّلَا نَظِیْرٌ مِنَ الْعِبَادِ وَعَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اَخَوَیْنِ" اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت علیؑ دونوں بزرگوار ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ حضرت علیؑ ہی جناب رسولؐ خدا کے علمدار تھے۔ چنانچہ طبری وغیرہ میں لکھا ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے تھے کہ جنگِ اُحد میں میرے ہاتھ میں زخم لگا اور علم میرے ہاتھ سے گر گیا تو آنحضرت نے لوگوں سے فرمایا کہ علم کو ان کے بائیں ہاتھ میں دے دو کیونکہ یہ دین و دنیا میں میرے علمدار ہیں۔ یہ روایت

ابوسعید خدری صحابی رسولؐ سے بھی منقول ہے جس کو دیلمی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر اور دیگر تمام لڑائیوں میں آنحضرتؐ کے علمدار حضرت علیؑ ہی تھے یہ عبارت علامہ احمد بن حنبل نے مناقب میں درج کی ہے۔

فتح مکّہ کے دن بھی آنحضرتؐ کا عَلَم جناب علیؑ مرتضیٰ ہی کے ہاتھ میں تھا اور آپ اس لشکرِ عظیم کے علمبردار تھے جنگ بدر ہو یا اُحُد ہو خیبر و خندق ہو یا فتحِ مکّہ و حُنین حضرت علیؑ کی شعلہ بار تیغ کے جوہر ہر جگہ نمایاں ملیں گے آپ کے دستِ بازو اور علم و عمل اور اخلاقِ حسنہ کی مجموعی طاقت نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دی اور ہر میدانِ عمل میں آپ ہمیشہ نمایاں رہے۔ بہادری کے ساتھ ترم دلی اور ہمدردی آپ کی شجاعت کے مخصوص اصول ہیں۔ دشمن پر قابو پاکر اُس کے ساتھ نرمی کرنا اور پوری فتح کے بعد اپنے مغلوب حریف کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا آپ کے محاسنِ اخلاق کے بینظیر ہونیکا پورا ثبوت دیتے ہیں تمام مؤرخین نے آپکے ان خصوصیات کو متفقہ طور پر تحریر کیا ہے مُسلم مؤرخوں کے علاوہ یوروپین مُصنفین

نے بھی علیؑ بن ابی طالب کے ان اوصاف کو سراہا ہے۔ مسٹر کارلائل نے بھی جو گذشتہ صدی کے مشہور انگریزی مورّخ ہیں اپنی کتاب (HEROES AND HEROES WORSHIP) میں آپ کے اِن صفات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

آپ کی عظیم جنگی خدمات ہر مورّخ کی زبان پر ہیں اور کوئی شخص اُن سے انکار نہیں کر سکتا تمام دنیا آپ کی تلوار کا لوہا مانے ہوئے تھی۔ بڑے بڑے بہادر اور مشہور معروف شہسوار آپ کے نام سے کانپ اُٹھتے تھے آج تک یہ دستور ہے کہ جب کوئی مسلمان پہلوان اپنے حریف کے مقابل جاتا ہے تو یاعلیؑ کا نعرہ لگاتا ہے گویا بہادری اور شجاعت علیؑ کیلئے مخصوص ہو گئی تھی یہاں تک کہ تاریخ میں یہ فقرہ آگیا کہ "لَمْ یَکُنْ فَارِسٌ فِیْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَشْجَعَ مِنْ عَلِیّؑ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ" آنحضرت کے عہد مقدّس میں علیؑ بن ابی طالب سے زیادہ کوئی شجاع و بہادر موجود نہ تھا۔ اسلام کی پہلی بڑی جنگ جو رمضان ۲ھ میں ہوئی وہ بدر تھی اس میں انصار و مہاجرین نے بے جگری اور بہادری کا ثبوت دیا تھا اور بے سر و سامان مسلمانوں کی چھوٹی سی فوج نے جس کی کل تعداد ۳۱۳ تھی دشمن کی بھاری

فوج کے منہ پھیر دیئے تھے۔ بدرِ کبریٰ سے پہلے بھی چند چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہی تھیں لیکن یہ جنگ بڑی فیصلہ کن تھی اور اسی پر مسلمانوں کی زندگی اور موت کا انحصار تھا اگر اس لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو بظاہر اُن کی تباہی یقینی تھی لیکن رسولِ اسلام کی برکتِ دعا اور مسلمانوں کے عزمِ جہاد اور استقلال و صبر کی طاقت نے تاریخ میں مسلمانوں کو وہ بلند مقام دے دیا جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ اس فیصلہ کن معرکۂ حق و باطل میں دشمن کے ستّر آدمی مارے گئے تھے جن میں کثیر تعداد اُن لوگوں کی تھی جنکی شجاعت و بہادری پر سارے قریش کو فخر تھا ان مقتولین میں سے قطعی طور پر چھبیس نامور بہادر حضرت علیؑ بن ابی طالب کی خون آشام تیغ کے گھاٹ اترے تھے جن میں وَلِید بن عُتبہ، نوفل بن خُوَیلد اور شیبہ جیسے مشاہیر شامل ہیں اور جن کی طاقت و دلیری پر قریش کی فوج کو بڑا گھمنڈ تھا مگر علیؑ کی تلوار نے اُنکی بہادری کو خاک میں ملا دیا اور اُن کی زندگی کے لیئے موت کا پیغام بن گئی۔

۷ھ کی جنگِ خیبر بھی ایک یادگار لڑائی تھی جس میں مسلمانوں کو عرب کی ساری صیہونی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا اور اسی

میں بھی اسلام کی موت و زندگی کا مسئلہ درپیش تھا۔ خیبر کا مشہور قلعہ قموص جو کسی سے فتح نہ ہو سکا تھا علیؑ کی تلوار کی تاب نہ لا سکا اور فتح ہو گیا۔ خیبر کی جنگ میں علاوہ اُس کثیر تعداد کے جو آپ کی تلوار کے گھاٹ اُتری تھی، یہودی فوج کے نو بڑے مشہور بہادر تھے جن میں مرحب، عنتر، حارث و ربیع خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ مرحب، حارث کا بڑا بھائی تھا جب حارث کے قتل ہونے کی خبر اُسے پہنچی تو جھلا کر اپنے جسم پر اسلحہ لگایا اور قلعہ کے باہر نکل آیا۔ مورخ یعقوبی نے لکھا ہے کہ مرحب کا شمار ایک ہزار پہلوانوں کے برابر ہوتا تھا۔ یہ پہلے ہی سے مسلح تھا مگر علیؑ کا نام سن کر اس نے دو زرہیں اور دو خود پہنے، دو تلواریں لگا کر اور اپنے جسم کی پوری طرح حفاظت کر کے شیرِ خدا کے سامنے آیا۔ مرحب نے بھائی کی لاش دیکھی تو اُس کے غصہ کی کوئی حد باقی نہ رہی اور غیظ و غضب کے شعلے اُس کے دل و دماغ کو جلانے لگے۔ دشمن کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور تیزی سے اُس نے تلوار گھسیٹی اور دامادِ رسولؐ پر حملہ کر دیا اور یہ رجز پڑھنے لگا۔

قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ اَنِّی مَرْحَبُ   شَاکِی السِّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبُ

سارا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں اور وہ آزمایا ہوا بہادر ہوں جس کا دنیا لوہا مانے ہوئے ہے اور جو سلاحِ جنگ سے آراستہ ہو کر بڑی شان و شوکت و عظمت کا مالک ہو جاتا ہے۔ اِدھر علیؑ بن ابی طالب غضبناک شیر کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑے اور اُس کی رجز کے جواب میں یہ کہتے ہوئے بڑھے:۔

اَنَا الَّذِی سَمَّتْنِیْ اُمِّی حَیْدَرَہ ضِرْغَامُ اٰجَامٍ وَلَیْثٌ قَسْوَرَہ

میں وہ ہوں جس کی ماں نے اس کا نام حیدر رکھا ہے، میں شیر بیشۂ جنگ ہوں جو شکار کو چیر ڈالتا ہے۔ رجز کا خاتمہ اور مقابلہ کا آغاز ساتھ ہی ہوا۔ مرحب نے حملہ کیا لیکن شیرِ خدا کی تلوار قضائے الٰہی بن کر اُس پر گر گئی اور دونوں خود کاٹ کر سینہ کو کاٹتی ہوئی جسم کے دو ٹکڑے کر کے نکل گئی اور مرحب سا قوی ہیکل اور زبردست پہلوان دو ٹکڑے ہو کر زمین پر لوٹنے لگا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اسی جنگ میں پیغمبرِ اسلام نے حضرت علیؑ کو شیرِ خدا کا لقب عطا فرمایا تھا۔

جب علیؑ اتنی بڑی فتح حاصل کر کے آئے تو آنحضرتؐ خوش ہو کر بھائی کے استقبال کے لیئے خود آگے بڑھے اور علیؑ کو گلے سے لگا لیا اور دونوں آنکھوں کو بوسہ دیا اور فرمایا:

قَدْ بَلَغَنِیْ نَبَاءُ کَ الْمَشْکُوْرُ وَ سَعْیُکَ الْمَذْکُوْرُ قَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْکَ وَ رَضِیْتُ اَنَا عَنْکَ۔"

اے علیؑ تمہاری قابلِ شکریہ کوشش اور مشہور زبان زدِ خاص و عام بہادری کی مجھے اطلاع ہے۔ خدا تم سے راضی ہوا اور میں بھی تم سے راضی ہوں" اس وقت رسولؐ کی یہ ہمت افزائی اور قدردانی دیکھ کر علیؑ مرتضیٰ کی آنکھوں میں خوشی اور تشکر کے آنسو آ گئے اور سجدۂ خالق میں جھک گئے۔

لیکن ان تمام جنگی کارناموں کے ساتھ ہی علیؑ مرتضیٰ کا وہ کردار خاص طور پہ پیش نظر رکھنے کی چیز ہے جو فتح اور اقتدار حاصل کرنے کے باوجود اپنی آپ ہی مثال تھا نیز سردارانِ فوج اور عُمّالِ سلطنت کے نام آپ کے احکام دیکھنے کے قابل ہیں جو فوج کشی، محاصرہ یا کسی خاص جنگی موقع پہ جاری فرمائے گئے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنین کی سچی بہادری نے حریف کے ساتھ نرمی و ہمدردی اور مروت کے ساتھ کس طرح مقابلہ کرنے کی اجازت دی ہے حضرت علیؑ نے جنگ کے ان وحشیانہ طریقوں کو سرے سے مٹا دیا تھا جو قدیم زمانہ سے جاہل قوموں کا امتیازی نشان بنے ہوئے تھے۔ آپ کے یہاں شجاعت کے ساتھ

انتقام کا نام تک نہ تھا جو کچھ تھا وہ صرف مدافعت تھی وہ بھی ایسے وقت جب حریف بالکل سر پر آپہنچے اور اس کی تلوار گلے سے مل جائے تمام لڑائیوں میں علیؑ کا یہی مسلک رہا ہے اور آپ ہمیشہ اسی اصول پر قائم رہے ہیں قدیم زمانہ میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی بہادر اپنے مقابل کو مار لیتا تھا تو جو سامان مقتول کے جسم پر ہوتا تھا وہ قاتل کی ملکیت سمجھا جاتا تھا حضرت علیؑ نے اس وحشیانہ قاعدہ کو بھی توڑ دیا تھا اور غزوۂ خندق میں عمرو بن عبدِ وَدّ کے اسلحہ کو لینے سے آپ نے انکار کر دیا۔

بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؑ مرتضیٰ جنگِ خندق میں عمرو بن عبدِ وَدّ کے سینہ پر تھے اور اُس کا سر کاٹنا چاہتے تھے اسی حالت میں اُس نے اپنے لعاب دہن سے بے ادبی کی شیرِ خدا حضرت علیؑ کو غصہ آیا مگر یہ خیال کر کے فوراً اُس کے سینہ سے اُتر آئے کہ اللہ کے کام میں جذبۂ نفس شامل نہ ہو اور جب غصہ کم ہوا اُس وقت آپ نے دشمن کا سر قلم کیا اور رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علیؑ نے اپنے اس طرزِ عمل سے بتا دیا کہ وہ سفاکی، بیدردی اور خونخواری کو پسند نہیں کرتے، اُن کی جنگ کسی مادی اور دنیاوی مقصد کے لیئے نہ تھی بلکہ وہ اصول کی

جنگ تھی - وہ توحید کیلئے جنگ تھی وہ مریض انسانیت کو جہل و
سرکشی اور غرور و ظلم و استبداد کی بیماریوں سے نجات دینے
کے لیئے تھی اور وہ صرف اُس وقت ہوتی تھی جب جنگ کے
علاوہ اصلاح کا کوئی راستہ باقی نہ رہے -

حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام کی عربی زندگی
کی باقاعدہ ابتداء جنگ بدر کبریٰ سے ہوئی اور عہدِ رسالت
کے حدود میں کوئی ایسی بڑی جنگ نہیں ہوئی جس میں شیرِ خدا
نے شرکت نہ فرمائی ہو اور دادِ شجاعت نہ دی ہو - جنگ اُحد
اور بعض دوسری جنگوں میں آپ بے حد زخمی بھی ہو گئے
تھے یہاں تک کہ جسمِ اقدس کا شاید ہی کوئی سامنے کا حصہ
ایسا بچ گیا ہو جہاں زخم نہ لگے ہوں مگر آپ نے کبھی زخموں
کی پرواہ نہ کی - اسی کے ساتھ آپ کی بے مثال شجاعت کی ایک بڑی
خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ نے کبھی کسی لڑائی میں دشمنوں کی
طرف سے پشت نہیں پھرائی اور کبھی آپ سے میدانِ جنگ
یا کسی دوسرے موقع پر بزدلی کا شائبہ تک ظاہر نہیں ہوا -
دنیا کی پوری تاریخ میں ایسا کوئی بھی شہسوار اور مردِ میدان
نہیں ملتا جس نے اپنی تمام عمر میں کسی موقع پر بھی دشمن سے

شکست نہ اٹھائی اور ہمیشہ فتح کا سہرا اسی کے سر رہا ہو۔ سوائے شاہِ لافتیٰ، شیرِ خدا و رسولؐ، زوجِ بتولؑ، سیدالاوصیاءؑ حضرت علیؑ بن ابیطالب علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کے یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ آپ صرف میدانِ جنگ ہی کے بہادر نہ تھے بلکہ ہر میدانِ عملِ صالح کے مثالی بہادر تھے، خواہ اُس میدان کا تعلق انسانی زندگی کے کسی شعبہ ہی سے کیوں نہ ہو اور اس طرح وہ شجاعت جو ایک سچّے مردِ مؤمن کی حیات کا حاصل ہے، حضرت علیؑ مرتضیٰ اُس کا کامل ترین نمونہ تھے۔

شیعہ غیبتِ امامؑ کے زمانہ میں دفاعی جہاد کو واجب سمجھتے ہیں

مجاہدینِ اسلام کیلئے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی مشہور دعا کے بعض جملے

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ الشیخ زین الدّین العاملی شہید ثانی علیہ الرحمہ نے کتاب "لمعۂ دمشقیہ" کی شرح میں اقسام جہاد پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے "وَجِہادُ مَنْ یَدْھَمُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ مِنَ الْکُفَّارِ بِحَیْثُ یَخَافُوْنَ مِنَ اسْتِیْلَائِھِمْ عَلیٰ بِلَادِھِمْ اَوْ اَخْذَ مَالِھِمْ وَمَا اَشْبَھَہٗ وَاِنْ قَلَّ" مسلمانوں پر حملہ کرنے والے کافروں سے دفاعی جنگ کرنا بھی جہاد ہے جبکہ اس بات کا خوف ہو کہ وہ مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرلیں گے یا اُن کے اموال اور جائداد وغیرہ پر تسلّط حاصل کریں گے اگرچہ وہ چیزیں بہت تھوڑی ہی کیوں نہ ہوں علّامہ زینُ الدّین عاملی اس قدر لکھنے کے بعد پھر تحریر فرماتے ہیں:

"اَوْ هُجُوْمِ عَدُوٍّ عَلَى الْمُسْلِمِیْنَ یُخْشٰی مِنْهُ عَلٰی بَیْضَةِ الْاِسْلَامِ فَیَجِبُ حِیْنَئِذٍ لِغَیْرِ اِذْنِ الْاِمَامِ اَوْ نَائِبِهٖ"

یعنی مسلمانوں پر کفار کے حملہ کی صورت میں جب کہ اسلام خطرہ میں ہو امام علیہ السلام یا ان کے نائب خاص کے اذن خصوصی کے بغیر دفاعی جہاد کرنا اور اسلام و مملکت اسلامیہ کو غیر مسلموں کے حملہ سے بچانا اور اس مقصد کے لیئے جنگ کرنا واجب ہے۔ موصوف پھر لکھتے ہیں۔

"وَلَوْ خِیْفَ عَلٰی بَعْضِ الْمُسْلِمِیْنَ وَجَبَ عَلَیْهِ فَاِنْ عَجَزَ وَجَبَ عَلٰی مَنْ یَلِیْهِ مُسَاعَدَتُهٗ فَاِنْ عَجَزَ الْجَمِیْعُ وَجَبَ عَلٰی مَنْ بَعُدَ"

اگر کفار کا حملہ مسلمانوں کے کسی ایک فرد یا گروہ پر ہو تو خود اس فرد یا اس گروہ پر اس حملہ کا دفاع کرنا واجب ہے لیکن اگر وہ فرد یا گروہ تنہا کفار کے حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے تو پھر قرب و جوار کے دوسرے مسلمانوں پر اس فرد یا گروہ کی امداد کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور اگر وہ سب بھی کافروں کا مقابلہ نہ کر سکیں تو دور دراز مقامات کے ہر مسلمان پر ان کی حمایت اور مدد کرنا واجب ہے۔ دنیا کی کئی کروڑ شیعہ قوم کے اس عظیم مجتہد کی تحریر سے یہ امر واضح

ہوگیا کہ ملّتِ جعفریہ کے نزدیک غیبتِ امامِ عصر علیہ السلام کے موجودہ زمانہ میں دفاعی جہاد کرنا، بلادِ اسلامیہ سے کفّار کے خطرہ کو دور کرنا اور مظلوم دکمزور مسلمانوں کی جنگی، مالی اور ہر قسم کی امداد کرنا شرعاً واجب ولازم ہے اور اِس نُصرت و مدد سے پہلوتہی کرنا قطعاً حرام ہے۔

پاکستان بلاشبہ اسلامی مملکت ہے اس لیے اس کا تحفّظ اور اس سے کفّار درندوں کو دفع کرنا، اور اُن کے حملوں کا منہ توڑ جواب دینا، اُن کی جارحانہ سازشوں کا استیصال کرنا اور اُن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دفاعی جہاد میں حصّہ لینا نیز مجبور اور مظلوم مسلمانوں کی حمایت ونصرت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے چاہے وہ نصرت دحمایت محاذ پر جنگ کے ذریعہ سے ہو یا مالی، اخلاقی، نظم وضبط کے قیام اور مسائلِ زندگی میں باہمی ہمدردی اور اخوّت کے جذبات کے عملی اظہار کی صورت میں ہو۔ اس دفاعی جہاد کے لیئے امام علیہ السلام کے اذنِ خصوصی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اُن کی عمومی اجازت اور اذنِ مطلق اِس جہاد کے لیئے کافی ہے۔ حضرات ائمۂ اہل بیت علیہم السلام نے مسلمانوں کو نہ صرف

اس دفاعی جہاد کی اجازتِ عام دیدی ہے بلکہ اسے واجب قرار دیا ہے اور ساتھ ہی بلادِ اسلامیہ کی حفاظت کرنے والوں کی اس عظیم دینی خدمت کی مدح وثنا بھی فرمائی ہے اور مجاہدینِ اسلام کی فتح وکامیابی کے لیئے دعائیں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں فرزندِ رسولؐ حضرت امام علی بن الحسینؑ زین العابدین علیہ السلام نے اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کے لیئے اپنی ایک مشہور دعا میں جو آپ کی دعاؤں کے مجموعہ (صحیفۂ کاملہ) میں "دُعَاءُ لِاَھْلِ الثُّغُوْرِ" (سرحدوں والوں کے لیئے دعا) کے نام سے مشہور ہے - یہ فرمایا ہے اور ان لفظوں کے ساتھ اِس مبارک دعا کو شروع کیا ہے:-

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَحَصِّنْ ثُغُوْرَ الْمُسْلِمِیْنَ بِعِزَّتِکَ وَاَیِّدْ حُمَاتَھَا بِقُوَّتِکَ" پروردگارا! محمدؐ وآلِ محمدؐ پر درود بھیج اور مسلمانوں کی سرحدوں کو اپنے اقتدار وعزت کے ذریعہ سے استحکام عطا فرما اور اپنی قوت وقدرت سے اُن کی حفاظت وحمایت کرنے والوں کی تائید ونصرت فرما اس کے بعد امامؑ عالی مقام نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے

کہ خدایا! مسلمانوں کی سرحدوں کی حفاظت کرنیوالوں کی تعداد میں اضافہ کردے، اُن کے اسلحۂ جنگ کو تیز تر بنا دے، اُن کی سرحدوں کے حدود کی نگہبانی کر اور اُن کے مرکز کی حفاظت کرنے والوں میں بھرپور اتحّاد و اتفاق پیدا فرما انکی رسد اور رزق کو وافر بنا دے۔ اُنھیں اپنی نصرت اور صبر کی دولت عطا کر، جو باتیں وہ نہیں جانتے ہیں اُنھیں سکھادے اور جن چیزوں کا اُنھیں علم نہیں ہے اُن کی انھیں معرفت عنایت فرما۔ بارالہا! جب وہ بہادر میدانِ جنگ میں دشمن کے سامنے صف آرا ہوں تو اُن کے دلوں سے رشتہ داروں، اہل وعیال اور دنیا کی دولت اور عیش و آرام کی محبّت کو نکال دے۔

جنّتوں کی نعمتوں کو اور اُن کے باغ و بہار کو اُن مجاہدوں کی نگاہوں کے سامنے ظاہر کردے۔ پروردگارا! اپنی نصرت و مدد سے مسلمانوں کے دشمنوں کی قوّت کو توڑ دے اور اُن کے خونخوار ناخنوں کو قطع کردے، اُن کے اسلحہ سے اُن کو محروم کردے اور اُن کے سارے سہارے توڑ دے اُن کے لیئے ہر قسم کی مدد کے راستے بند کردے، انکے دلوں کو خوف اور

ہر اس سے بھر دے، اُن کی نسلوں کو تباہ و برباد کر دے، آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار کو اُن کے لیے روک دے اور اُن کو قحط میں مبتلا کر دے۔

خداوندا! تو اپنی نصرت کے ذریعہ سے مسلمانوں کی قوت و طاقت کو بڑھا اور اُن کے ملکوں اور آبادیوں کو مستحکم اور محفوظ کر دے اور دشمن پر اُن کو فتح عطا فرما یہاں تک کہ زمین پر تیرے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کی جائے۔

حضرت امامؑ نے اِس کے بعد فرمایا ہے:۔

اَللّٰھُمَّ وَاعْمُمْ بِذٰالِکَ اَعْدَآئَکَ فِیْ اَقْطَارِ الْبِلَادِ مِنَ الْھِنْدِ وَالسَّقَالِبَۃِ وَالدَّیَالِمَۃِ وَسَائِرِ اُمَمِ الشِّرْکِ"

خداوندا! اپنے عذاب کی آگ کو اپنے دشمنوں پر عام کر دے جو اِس کُرۂ زمین کے مختلف خِطّوں میں پھیلے ہوئے ہیں جیسے ہند، سقالبہ اور دیالمہ اور اِن کے علاوہ تمام دوسرے مشرکوں اور کافروں کے مُلک۔"

اَللّٰھُمَّ اَخْلِ قُلُوْبَھُمْ مِنَ الْاَمَنَۃِ وَاَبْدَانَھُمْ مِنَ الْقُوَّۃِ

وَابْعَثْ عَلَيْهِمْ جُنْدًا مِّنْ مَلَائِكَتِكَ بِبَأْسٍ مِّنْ بَأْسِكَ كَفِعْلِكَ يَوْمَ بَدْرٍ۔"

پروردگارا! ان کافروں کے دلوں کو امن و اطمینان سے اور ان کے بدنوں کو طاقت و قوت سے خالی اور عاری کر دے اور ان پر ملائکہ عذاب کو نازل فرما جس طرح تو نے اپنے رسولؐ کی مدد کے لیئے جنگِ بدر میں کیا تھا۔"

پھر دوسرے بلادِ کفر کے لیئے سخت ترین بد دعا کرنے کے بعد آپ نے فرمایا:

"وَاَيُّمَا غَازٍ غَزَاهُمْ مِّنْ اَهْلِ مِلَّتِكَ اَوْ مُجَاهِدٍ جَاهَدَهُمْ مِنْ اَتْبَاعِ سُنَّتِكَ۔ فَلَقِّهِ الْيُسْرَ وَاَصْحِبْهُ السَّلَامَةَ وَاَعْفِهِ مِنَ الْجُبْنِ وَاَلْهِمْهُ الْجُرْاَةَ وَارْزُقْهُ الشِّدَّةَ وَاَيِّدْهُ بِالنُّصْرَةِ"

اے اللہ! جب تیرا کوئی غازی اور مجاہد کافروں سے جہاد کرے تو اُس کو ہر قسم کی آسانی عطا فرما۔ سلامتی کو اُسکا ساتھی بنا دے، بُزدلی اور بودے پن کو اُس کے قریب نہ آنے دے۔ اُسے جرأت و شجاعت عطا کر اور اپنی نصرت

سے اس کی تائید فرما۔

اے میرے خدا!

ہر وہ مسلمان جو کسی مردِ غازی یا اسلامی سرحدوں کے کسی محافظ کے گھر کی حفاظت کرے اور اُس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر والوں کا خیال رکھے یا اُن غازیوں اور مجاہدوں کی اپنے مال اور وسائل سے امداد کرے یا کسی طرح سے بھی اُن کے جوشِ جہاد میں اضافہ کرے، اے خدا تو ایسے شخص اور ایسے لوگوں کو بھی اسی قدر اجر و ثواب عطا فرما جتنا ثواب تو نے خود اُس مجاہد اور غازی کے لیئے مقرر فرمایا ہے، اے میرے پروردگار! ہر وہ مسلمان جس کا دل اسلام پر کفر کے حملہ سے غمگین ہو اور جس کو مسلمانوں کے خلاف مشرکوں اور کافروں کی جتھا بندی کرنے سے قلبی صدمہ ہو اور وہ جہاد کا ارادہ کرے اور میدانِ جنگ میں جانے کا عزمِ مُحکم رکھتا ہو مگر ضُعف اور کمزوری اُس کی راہ میں حائل ہو جائے یا فقیری اور تنگدستی اُسے مجبور کر دے یا کوئی حادثہ اور مانع پیدا ہو جائے جس کے سبب سے وہ اپنے اِس ارادہ میں

کامیاب نہ ہو سکے، اے پروردگار تو اُس مسلمان کا نام بھی عبادت کرنے والوں کی فہرست میں داخل فرما، اُس کو مجاہدوں کا اجر و ثواب عطا کر اور اُسے بھی شہداء و صالحین میں شمار فرما تیری ذات سب سے بزرگ و برتر ہے۔

یہ اُس عظیم دعا کا مختصر اقتباس تھا جو حضرت شہید کربلاء کے فرزند امام زین العابدین علیہ السلام سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے مجاہدوں کے لیئے منقول ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہادر اسلامی سپاہیوں کی محبت اور عزت آلِ محمد علیہم السلام کے قلوب طاہرہ میں کس قدر تھی! اِن تمام حقائق کے پیش نظر پاکستان کے ہر مسلمان کا خصوصاً اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا عموماً یہ اسلامی فرض ہے کہ اسلام کی عزت و وقار کی حفاظت میں جان و مال اور اولاد کی بازی لگا دیں اور دنیا کی عظیم ترین مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے ایک ایک چپے کی حفاظت کریں تاکہ اس پر کسی دشمن کے ناپاک قدم نہ آنے پائیں اور کافر بت پرستوں اور وحشی درندوں کو ایسا عبرتناک سبق دیں

بس کے بعد پھر کبھی انھیں سرزمین پاک کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے۔ پاکستان کی تمام جماعتیں اپنے باہمی اختلافات کو دفن کر دیں اور آہنی دیواریں بنکر اپنی قابلِ فخر بہادر فوجوں کے دوش بدوش باطل کے پجاریوں کی صفوں کو پاش پاش کر دیں ایسی لڑائی دو ملکوں کی نہیں ہوتی بلکہ کفر و اسلام اور بُت پرستی و توحید پرستی کی جنگ ہوتی ہے۔ ایسی لڑائی میں جس طرح سے بھی ممکن ہو شرکت کرنا ہر مسلمان کے لیئے واجب ہے خواہ یہ شرکت خون سے ہو یا مال اور دوسرے وسائل سے یا زبان و عمل سے۔ ایسے دِفاعی جہاد میں جو جان دیگا وہ شہید ہوگا اور اگر کسی اور طرح کی بھی خدمت کرے گا اور کسی قسم کی بھی قربانی پیش کرے گا تو اسے بھی شہادت کا اجر و ثواب ملے گا۔

یہ بات بھی خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ دفاعی جہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جب دشمن ہمارے سروں پر آجائے تو اُس وقت ہم اُس سے جنگ کریں اور اُس کو ہٹانے کی کوشش کریں بلکہ دِفاع کا مفہوم اِس سے بہت زیادہ وسعت

رکھتا ہے۔ اگر ہمیں اس کا یقین ہو جائے کہ ایک درندہ یا کوئی زہریلا سانپ بہت دور سے صرف ہمارے ہی ارادہ سے چلا آرہا ہے یا ہماری تاک میں بیٹھا ہوا ہے اور موقع پاتے ہی ہم پر چڑھ دوڑے گا تو ہمارا فرض ہو گا کہ ہم اپنے مقام پر نہ بیٹھے رہیں بلکہ آگے بڑھیں اور اس جگہ جا کر چاہے وہ کتنی ہی دور ہو، اپنے اس دشمن کا خاتمہ کر دیں اور اس خطرہ کو فنا کر دیں۔

یہ صورت حال قطعی طور پر دفاعی ہو گی اور کسی طرح بھی جارحانہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس لیئے دفاعی جہاد کا یہ مفہوم لینا غلط ہے کہ ہم دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقع دیں اور چپکے بیٹھے رہیں بلکہ اپنے یقینی دشمن کی ہر طاقت اور اس کے ہر خطرہ کو ہٹانے کی تمام کوششیں دفاعی جہاد کی تعریف میں داخل ہوں گی اس کے علاوہ ایک اہم رخ یہ بھی ہے کہ جہادِ مطلق عورتوں، بچوں، زیادہ بوڑھوں اور مجبوروں پر سے ساقط ہے مگر دفاعی جہاد کسی سے بھی ساقط نہیں ہوتا۔ بلاشبہ پاکستان کے مسلمان اُن بہادر اسلامی نسلوں کے وارث دار ہیں جن کی "تلواروں" کے شعلوں

لے کرۂ زمین کے ہر خطہ میں کفر و شرک کے خرمنوں کو جلا کر خاکستر بنا دیا تھا۔ اب ہمیں بھی یہ ثابت کرنا ہے کہ کہ ہم اُن کے صحیح جانشین ہیں اور ہماری رگوں میں بھی وہی کھولتا ہوا خون اور دلوں میں وہی کوہ شکن عزم و ہمّت موجود ہے ہمیں یقین کامل ہے کہ ہم حق پر ہیں اور خدا کی نصرت ہمارے ساتھ ہے۔ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ" یاد رکھو کہ جنّت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔ فاتحِ خندق و خیبر حضرت حیدر کرارؑ کا اعلان ہم سن چکے ہیں :-

اِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِّنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ اَوْلِیَائِهٖ"

جہادِ راہِ خدا جنّت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے خاص دوستوں کے لئے کھولا ہے ہمیں شیرِ خداؑ کا دیا ہوا یہ سبق پوری طرح یاد ہے کہ ایک بہادر اور سچّے مسلمان کی نظر میں میدانِ جہاد میں اُس کی موت ٹھنڈے پانی کے اُس جام سے کہیں زیادہ خوشگوار ہے جو ایک پیاسے

کے منہ سے لگا ہوا ہو اور ہم سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ کی اُس للکار کو کبھی بھولے نہیں ہیں کہ:
"اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ" ننگ و رسوائی اختیار کرنے سے مر جانا کہیں بہتر و افضل ہے!

ہم مسلمان ہیں، ہم فرزندانِ توحید ہیں، ہمیں اللہ نے کفر اور شرک کی غلامی کے لئے نہیں پیدا کیا ہے، ہم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، ہمیں دنیا کی کوئی طاقت تسخیر نہیں کر سکتی۔

خیبر شکن

انسانی زندگی نے لاکھوں پلٹے کھائے، زمانہ نے ہزاروں کروٹیں بدلیں، دنیا کی تاریخ میں بے شمار شخصیتیں اُبھریں اور پھر فنا ہوگئیں مگر رہتی دنیا تک نام رہیگا اُن ہستیوں کا جن کے بے مثال کردار اور عظیم کارناموں نے اُنہیں غیر فانی بنا دیا اور تاریخ میں اُن کو وہ مقام حاصل ہوگیا جس کو گردشِ زمانہ کے تباہ کن ہاتھ مٹانے کی جرأت نہ کر سکے۔

اُن کے نظریات اور اُن کی زندگی ہر دور میں انسانی نسل کے لیئے شمع راہ بنی رہی اور اُنھوں نے اپنی قوّتِ عمل سے انسانی فکر کے لیئے ایک نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کر دی ایسی ہستیاں ملک و قوم اور دوسرے شخصی تصوّرات سے اونچی ہو کر تمام عالمِ انسانیت کے لیئے بے پناہ عقیدت و محبّت کا مرکز بن جاتی ہیں جس میں مکان و زمان کی قیدیں باقی نہیں

رہتیں۔

حضرت علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کا مبارک وجود بھی انسانیت کا ایک ایسا ہی بلند ترین شاہکار تھا۔ آپ نے اپنی قوتِ فکر، اعلیٰ کردار اور بے نظیر طرزِ حیات سے ایسی مثالیں قائم کردیں جو انسانی تاریخ کے سامنے ہمیشہ باقی رہیں گی اور ہر زمانہ کے لوگ اُن سے شرفِ ہدایت حاصل کرتے رہیں گے۔ ایک صحیح احساس اور حقیقی شعور رکھنے والے دماغ کو آپ کی مقدس سیرت میں ہر وہ سامان ملتا ہے جو گمراہ انسانیت کے لیئے وجہِ ہدایت اور بے چین فطرت کے لیئے باعثِ سکون و اطمینان ہے آپ کی پاکیزہ زندگی انسانیت کے ہر جائز تقاضے کو پورا کرتی ہے اور اُس کے ہر مرض کا علاج ہے۔

اگر اس حکیمِ انسانیت کو ملک کے اندرونی جھگڑوں اور آپس کی نزاعوں میں مشغول نہ کر دیا جاتا تو یقیناً دنیا کو اور زیادہ آپ کی ذات سے ہدایت حاصل کرنے کا موقع دستیاب ہوسکتا۔ پھر بھی پے در پے جنگوں اور دوسری رکاوٹوں کے باوجود آپ نے کوئی ایسی نصیحت نہیں چھوڑی جو بیان نہ

فرمائی ہو۔ آپ کا ہر خطبہ حکمت و معرفت اور ارشاد و ہدایت کا مجسمہ ہے!

مسلمانوں کے سلسلۂ خلافت میں آپ کا دور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ سے شروع ہوا تھا اپنی کچھ اوپر چار سال کی حکومت میں آپ کو اپنے مخالفوں کی در پردہ اور ظاہر بظاہر سرگرمیوں کا بار بار مقابلہ کرنا پڑا اور وہ خطیب جو منبر سے دلوں کی تسخیر کرتا تھا اور اپنی تقریروں کے ذریعہ سے علم و معرفت کے موتی برساتا تھا اُسے اپنا بہت سا قیمتی وقت آپس کی جنگوں کے سپرد کرنا پڑا۔ اِن مشکلات میں ایک ایسے فرمانروا کا ثبات و استقلال جس کو حکومت ملے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہو، یقیناً اُس کے عزم و تدبّر کا ایک روشن ثبوت ہے اور ایسے نازک وقت میں مخالف سرگرمیوں کا مقابلہ کرنا، اور دینِ خدا پر آنچ نہ آنے دینا اُس کی ایک بڑی خصوصیت ہوگی۔

ملکی انتظامات سے متعلق آپ کے ارشادات، احکام، قوانین، ہدایت نامے اور دستور سلطنت کے ایک ایک حرف سے مملکت کے نظم و ضبط پر آپ کے قابو اور کامل اقتدار

کا پتہ چلتا ہے۔

اپنے ہدایت ناموں میں آپ نے گورنروں کے تقرر اور خود ان کے لیئے اپنی رعیت کے ساتھ اچھے برتاؤ کے طریقہ کو واضح فرمایا ہے۔ امن و صلح کے فائدے، خونریزی کے نقصانات، شوریٰ کے اصول اور عوام و حکومت کے تعلقات پر آپ نے روشنی ڈالی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو امور سلطنت کا کسقدر علم تھا اور انتظامِ حکومت پر کتنی قدرت حاصل تھی۔

اِس وقت تک دنیا نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے مگر آپ کے بنائے ہوئے نقش پہلے کی طرح اب بھی آخری نقوش ہیں اور آپ کے ہدایات پر کاربند ہونے میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی پوشیدہ ہے۔ حضرت علیؑ کے پورے نظام حکومت کی سب سے بڑی بنیاد شریعتِ محمدی کی متابعت اور اُس کی روح اطاعتِ خدا تھی۔

اسلام نے انسان کی اجتماعی زندگی کے لیئے صاف، پاکیزہ اور سادے مگر قوی اور مستحکم اصول قائم کیے تھے جن میں مکر و حیلہ اور دُھوکا دینے کا مطلق اندیشہ نہ تھا، اُن کی بنیاد

مُساوات کے اُس قانون پر رکھی گئی تھیں جو الٰہی عدل و انصاف کے مطابق تھا، جس کا تعلق بندگانِ خدا کے ہر طبقہ سے یکساں تھا، اور جس میں دل آزاری اور جبر و ظلم کا تصور بھی نہ تھا۔

حضرت امیر المؤمنین نے عوام کو علوم و فنون کی تحصیل کی طرف بھی ہمیشہ توجہ دلائی۔ مسلمانوں میں علمی ذوق و شوق کے رواج پانے میں آپ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اور اُن کو آپ کی اِن کوششوں سے بہت بڑا علمی سرمایہ دستیاب ہو سکا اور اب آپ کے یہ فیوض دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچ چکے ہیں۔ آپ کی تعلیم صرف زبانی نہ تھی بلکہ جو کچھ آپ نے فرمایا اُس پر پہلے خود بھی عمل کیا۔ آپ کی زندگی اِستغناء، توکّل، خوفِ خدا، زہد و تقویٰ کا ایک کامل نمونہ تھی۔ آپ نے اپنے عمل سے اِس حقیقت کو پوری طرح واضح فرما دیا کہ ایک انسان اپنے دنیاوی تعلّقات اور ضروریّات کے ساتھ تقرّبِ خدا کی تمام دشوار گذار منزلیں آسانی کے ساتھ کیونکر طے کر سکتا ہے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالب کی بہادری اور شجاعت بھی یادگارِ زمانہ تھی اور اسلام کی کوئی اہم جنگ ایسی نہ تھی جس میں

آپ نے شرکت اور اس کی علمداری نہ فرمائی ہو۔ مناقب امام احمد بن حنبل میں ہے: "کَانَ عَلِیٌّ اٰخِذَ رَایَةِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّمَ یَوْمَ بَدْرٍ وَّ الْمَشَاہِدِ کُلِّھَا"۔ جنگ بدر اور تمام دیگر لڑائیوں میں جناب علیؑ مرتضیٰ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمدار تھے۔

لیکن دلیری کے ساتھ ہمدردی اور سختی کے ساتھ نرمی آپ کی شجاعت کے مخصوص اصول ہیں۔ دشمن پر قابو پاکر اس کے ساتھ دوست سے بڑھ کر نرمی کرنا اور غلبہ پاکر اپنے مغلوب حریف کے ساتھ سچی ہمدردی سے پیش آنا، آپ کی ایک بڑی خصوصیت تھی۔ آپ کی سیرت میں انتقام اور کنبہ پروری کا نام تک نہ تھا۔ آپ نے ہمیشہ دفاعی جنگیں لڑیں، اور جب حریف بالکل سر پہ آ گیا اور پانی سر سے اونچا ہو گیا اس وقت تلوار اٹھائی۔

عربوں کا قدیم دستور تھا کہ جب کوئی بہادر اپنے مقابل کو قتل کرتا تھا تو وہ اس کے اسلحہ وغیرہ کا مالک سمجھا جاتا تھا مگر آپ نے اپنی عالی ہمتی سے کبھی اس کو پسند نہ فرمایا۔

اسلام کی مشہور جنگِ خندق میں جب عمرو بن عبدوَدّ کی

بہن روتی ہوئی اپنے بھائی کی لاش پر آئی اور اُس نے دیکھا کہ اُسکی لاش اسلحہ سے آراستہ ہے اور اُس میں کوئی چیز بھی اُس کے جسم سے نہیں اتاری گئی تو اُس نے حیرت سے قاتل کا نام دریافت کیا، اور جب اس کو نام بتایا گیا تو اپنے بھائی کی لاش کی طرف رخ کر کے یہ اشعار پڑھنے لگی:۔

لَوْ کَانَ قَاتِلُ عَمْرٍو غَیْرَ قَاتِلِہٖ لَکُنْتُ اَبْکِیْ عَلَیْہِ اٰخِرَ الْاَبَدِ
لٰکِنَّ قَاتِلَہٗ مَنْ لَّا یُعَابُ بِہٖ مَنْ کَانَ یُدْعٰی اَبُوْہُ بَیْضَۃَ الْبَلَدِ

اگر عمرو کا قاتل کوئی اور ہوتا تو میں اپنے بھائی پر عمر بھر روتی مگر اُس کا قاتل تو وہ ہے جس میں کوئی عیب ہی نہیں وہ ایسا شخص ہے جس کے باپ کا لقب "پشت پناہ شہر" مشہور ہے!

اس عمل سے آپ نے واضح کر دیا کہ اصلی بہادر اور سچا مردِ میدان وہی ہے جس کی سیرت میں انسانی تہذیب و تمدّن کی قدریں محفوظ ہوں اور اُس کا جذبۂ فرض شناسی کسی حالت میں بھی دوسرے وقتی اور ہنگامی جذبات سے مغلوب نہ ہو سکے۔

تمام شد

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؀